اسلامی بینکاری اور سودی بینکاری میں فرق

کے حوالے سے بعض سوالات کے جوابات

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

ناشر ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی

کریڈٹ کارڈ

کی

تاریخ۔ تعارف۔ شرعی حیثیت

﴿مؤلف﴾

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

ناشر

اسکالرز اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر ۱۷۷۷۷، گلشن اقبال، کراچی۔ ۷۵۳۰۰

اسلامی بینکاری
اور
سودی بینکاری میں فرق

کے حوالے سے بعض سوالات کے جوابات

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

ناشر

ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی

نام کتاب : اسلامی بینکاری

مؤلف : پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

کمپوزنگ : حافظ محمد عابد سعید (0300-3340980)

سن طباعت : مارچ ۲۰۰۸ء

ناشر : ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی، گلشن اقبال، پوسٹ بکس ۱۷۷۷۷، کراچی۔

فون: 4583426۔ موبائل: 0333-2376985

تعداد : ۱۰۰۰

صفحات : ۵۶

قیمت : ۲۵/- روپے

ملنے کے پتے:

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی

فریدی بک سینٹر، اردو بازار، کراچی

مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی

مکتبہ غوثیہ ہول سیل، سبزی منڈی، کراچی

مکتبہ فیض القرآن، اردو بازار، کراچی

مکتبہ قادریہ پرانی سبزی منڈی، کراچی

مکتبہ کاروان قمر دار العلوم قمر الاسلام سلیمانیہ کراچی۔

احمد بک کارپوریشن، راولپنڈی

جامعہ قادریہ رضویہ، سرگودھا روڈ، فیصل آباد

فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور۔

علامہ غلام نصیر الدین نصیر، جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو، لاہور

مکتبہ تنظیم المدارس، جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ، لاہور

اورینٹل پبلی کیشنز، متصل نادرز دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

مکتبہ رضویہ، داتا دربار مارکیٹ، لاہور

مکتبہ ضیاء القرآن، گنج بخش روڈ، لاہور

دار العلوم حنفیہ فریدیہ بصیر پور، ضلع اوکاڑہ

ملتان کتاب گھر، محلہ گھر، ملتان

نیا مکتبہ، ابدالی روڈ، پریس کلب ملتان

اسلامی بینکاری کو سمجھنے کیلئے چند سوالات اور ان کے جوابات

بعض حلقوں کی جانب سے اسلامی بینکاری کے حوالہ سے بعض تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے۔ عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کان ادھر سے پکڑیں یا ادھر سے بات ایک ہی ہے اور سودی بینکوں اور اسلامی بینکوں کے نظام میں کوئی فرق نہیں بلکہ صرف نام کا فرق ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غیر اسلامی نظام ہائے حکومت اور سودی مرکزی نظام معیشت کی موجودگی میں اسلامی بینکاری کے حوالہ سے تحفظات کا ہونا فطری بات ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سودی بینکاری اور اسلامی بینکاری نظام میں بہت بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر سرمایہ فراہم کرتا ہے اور اس پر سود لیتا ہے جبکہ ثانی الذکر (اسلامی بینکاری) سرمایہ فراہم نہیں کرتا بلکہ کاروبار میں خود شریک ہو کر سرمایہ کاری کرتا ہے اور مال فراہم کر کے منافع کماتا ہے۔

دنیا بھر کے نمائندہ مسلم علماء، جو فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، مجمع الفقہ الاسلامی اور دیگر اسلامی فورمز پر سال ہا سال سے اسلامی بینکاری پر فقہی بحث و مباحثہ کرتے رہے ہیں اور جنہوں نے کافی غور و تدبر کے بعد اسلامی بینکاری کے خط و خال مرتب کیے ہیں ان کی فقہی آراء، وفتاویٰ کو اجتماعی اجتہاد کا درجہ حاصل ہے اور ان کی برس ہا برس کی محنتوں کے ثمرات آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب کوئی بھی مسلمان کسی بھی اسلامی بینک کے ذریعہ مشارکہ، مضاربہ، مرابحہ، استصناع، اجارہ اور مساومہ کے شرعی طریقوں سے سرمایہ کاری اور کاروبار کر سکتا ہے۔

اسلامی بینکاری کرنے والے بینک اپنے اسٹاف کو اسلامی بینکاری کی خصوصی تربیت دے دلوا رہے ہیں، اور ملکی و بین الاقوامی سیمیناروں کے ذریعہ تاجر اور مذہبی طبقہ کے تحفظات کا ازالہ کیا جارہا ہے۔

ماڈرن اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی کو مجلہ فقہ اسلامی کے توسط سے اسلامی بینکاری کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف استفسارات موصول ہوتے رہے ہیں، جن کے جوابات بائی ڈاک سائلین کو ارسال کئے جاتے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ گزارش بھی کی جاتی رہی ہے کہ مزید اطمینان کیلئے مقامی طور پر مفتیان کرام سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اگر کسی سوال کے جواب میں کسی مفتی صاحب یا عالم دین کا کوئی اشکال ہو تو سائل مجلہ فقہ اسلامی کو مطلع فرمائے تاکہ تصحیح کی جا سکے۔ مگر ان جوابات پر کسی طرف سے کوئی اشکال سامنے نہیں آیا۔ چنانچہ افادہ عامہ کی خاطر انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اہل علم ان استفسارات کے حوالہ سے کسی مسئلہ میں کوئی متبادل نقطہ نظر رکھتے ہوں تو تصحیح کی غرض سے بذریعہ خط و کتابت ہماری رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

ایڈیٹر ماہنامہ فقہ اسلامی

پوسٹ بکس ۱۷۷۷۷، گلشن اقبال، کراچی۔ ۷۵۳۰۰

۱۰ جنوری ۲۰۰۷ء

ربو کیا ہے؟

شخصی اور تجارتی قرضوں پر ربو (سود) کی وضاحت

س: ۱ بعض تاجر حضرات کا کہنا ہے اور یہاں لاہور میں ایک درس قرآن میں ایک ماڈرن عالم نے کہا کہ قرآن نے جس سود (ربوا) کو حرام قرار دیا ہے وہ شخصی قرضوں پر سود ہے۔ جہاں تک تجارتی قرضوں کا تعلق ہے تو ان پر سودی لین دین کی ممانعت قرآن سے ثابت نہیں۔ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں کہ یہ بات کس حد تک درست ہے۔

جواب: **بسم الله الرحمن الرحيم وبه نستعين** ۔آپ کے سوال کا تعلق ربوا سے ہے اور ربوا کی تعریف جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اس سے ہے اور اس کی جو تعبیر نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی اور جس پر گزشتہ چودہ صدیوں سے جمہور علماء کا اتفاق ہے اس سے ہے تو سب سے پہلے تو ربوا کا حکم اور اس کی شرعی تعریف ملاحظہ فرمائیں:

اللہ جل مجدہ وعلا نے ربوا کے بارے میں فرمایا: **الذين ياكلون الربوا لا يقومون الا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس ذلك بانهم قالوا انما البيع مثل الربوا واحل الله البيع وحرم الربوا فمن جاء ه موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف وامره الى الله ومن عاد فاولئك اصحاب النار هم فيها خالدون () يمحق الله الربوا ويربي الصدقات والله لا يحب كل كفار اثيم ()**

پھر فرمایا:

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مؤمنین () فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ وان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون ().

ترجمہ آیات: وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، قیامت کے روز ایسے کھڑے ہوں گے جیسے وہ شخص جسے آسیب نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے (ہوگا) کہ انہوں نے یہ کہا کہ بیع (خرید وفروخت) بھی سود ہی کی طرح ہے۔ جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ تو جسے اس کے رب کے ہاں سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے سود لے چکا اس کی باز پرس نہ ہوگی۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اور جو اب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے۔ وہ اس میں مدتوں رہے گا۔ اللہ برباد کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات وخیرات کو اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور بڑے گناہ گار کو پسند نہیں فرماتا۔

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو جو کچھ تمہارا سود لوگوں کے ذمہ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر تیار ہو جاؤ اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کے لئے۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ کوئی تمہیں نقصان پہنچائے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوا ۔ یعنی اے اہل ایمان سود نہ کھاؤ پھر فرمایا **واحل اللہ البیع وحرم الربوا.**

اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

ذخیرہ حدیث شریف میں ربوا کے بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل

الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال (هم سواء) رواه مسلم۔

یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر اور سود لکھنے والے پر اور سود کے معاملہ کی گواہی دینے والے پر اور فرمایا وہ اس (گناہ) میں سب برابر ہیں۔

سود کے حرام ہونے کی احادیث، صحاح ستہ میں، مستدرک میں، صحیح مسلم میں، الدار قطنی میں، مسند بزاز میں اور سنن بیہقی وغیرہ میں موجود ہیں۔ ایک حدیث جو سود کے سلسلہ کی اساسی حدیث ہے حسب ذیل ہے۔

قال رسول الله ﷺ الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء، يدا بيد. فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذاكان يدابيد (متفق عليه)

یعنی: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے، سونا سونے کے عوض چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو۔ جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض، اور نمک نمک کے عوض برابر برابر، دست بدست، بیچو اور جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جیسا چاہو بیچو جب کہ وہ دست بدست فروخت ہوں۔

شریعت اسلامیہ نے قرآن وسنت میں وارد تعریف ربوا کے پیش نظر آسان لفظوں میں اسے اس طرح بیان کیا ہے: **الربوا فی الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فی معاوضة مال بمال (حاشیه هدایه)** یعنی ربوا شریعت میں وہ مال فاضل ہے جس کا کوئی عوض نہ ہو۔ گویا ربوا مال پر ایسی زیادتی ہے جو بغیر کسی معاوضہ کے حاصل کی جائے۔

ربوا کی ایک تعریف یوں بھی بیان کی گئی ہے: **زيادة احد البدلين المتجانسين من غير ان يقابل هذه الزيادة عوض۔**

یعنی ناپنے تولنے والی ہم جنس اشیاء، بلا عوض زیادہ لینا ربوا (سود) ہے۔

قرآن کریم کے نزول سے پہلے بھی عرب معاشرہ میں قرض پر لیا جانے والا منافع ربوا کہلاتا تھا۔ خواہ یہ قرض ذاتی ضرورت کے لئے ہو یا تجارتی مقصد کے لئے۔

(جواهر الفقه ج ۳ ص ۳۲)

علامہ ابن رشد نے لکھا ہے **اتفق العلماء على ان الربوا يوجد فى شيئين فى البيع وفيما تقرر فى الذمة من بيع او سلف او غير ذلك**

(بداية المجتهد ج ۷ ص ۱۰۶)

علامہ رازی فرماتے ہیں: **اما ربا النسيئة فهو الامر الذى كان مشهورا متعارفا فى الجاهلية . وذلك بانهم كانو يدفعون المال على ان ياخذوا كل شهر قدرا معينا ويكون راس المال باقيا ثم اذا حل الدين طالبوا المديون براس المال فان تعذر عليه الاداء زادو فى الحق وفى الاجل .** (التفسير الكبير ج ۷ ص ۸۵)

زمانہ جاہلیت میں لوگ اس شرط پر قرض دیا کرتے کہ مقروض سے قرض کے عوض ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم لیا کریں گے، اصل رقم مقروض کے ذمہ باقی رہتی، مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتا اگر مقروض اصل رقم نہ ادا کرسکتا تو قرض خواہ مدت بڑھا دیتا لیکن ساتھ ہی سود میں اضافہ کر دیتا تھا۔ زمانہ جاہلیت کے اس ادھار سود کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا۔

علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں: **والربا الذى كانت العرب تعرفه وتفعله انما كان قرض الدراهم والدنانير الى اجل بزيادة على مقدار ما استقرض على ما يتراضون به** (احكام القرآن ج ۱ ص ٤٦٥)

ربا کی وہ قسم جس کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے وہ تجارتی قرضوں پر سود کی ہے اس کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں: **واما ربوا البيوع فهو على**

نوعين. ربا النسيئة و ربوا الفضل. اما ربوا النسيئة في البيوع فهو بيع ربوي بربوي نسيئة. و ربوا الفضل هو بيع ربوي بمثله مع زيادة في احد المثلين (الفقه الاسلامي وادلته. وهبه الزحيلي - ج ٤ ص ٦٧١)

ربوا خواہ ذاتی قرض پر ہو یا تجارتی قرض پر بہر صورت حرام ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں: **والربوا بجميع انواعه حرام بالاتفاق سوى ماروى من خلاف عن ابن عباس في ربا الفضل وقد نقل عنه انه رجع عن قوله. (نيل الاوطار. للشوكاني ج ٥ ص ٢٠٣)**

آپ نے جو کچھ سنا کہ تجارتی قرضوں پر سود کو ربوا نہیں کہا جاسکتا یا اس ربا کو سود نہیں کہا جاسکتا یا یہ کہ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی یا یہ کہ ایسے قرضوں پر سود کی ممانعت نہیں۔ وغیرہ وغیرہ یہ چند ترقی پسند قسم کے دانشور کہلانے والے اسلام دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے۔ جس کی بنیاد اس دعوی پر ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل عرب دنیا میں جس قسم کے قرضوں کا رواج تھا وہ ایسے ذاتی قرضے تھے جو محتاج لوگوں کی بنیادی ضروریات کے لئے دیئے جاتے تھے اور کاروباری معاملات کے لئے سودی قرضوں کے لین دین کا کوئی رواج اس معاشرہ میں نہ تھا جس میں قرآن نازل ہوا۔ لہذا قرآن میں جس سود کی ممانعت ہے وہ ذاتی شخصی نوعیت کے قرضوں پر سود کی ہے۔ یہ دعوی دراصل ایک مفروضہ پر قائم ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مولانا محمد طاسین نے متبادل سودی نظام کے دعوے نامی اپنی ایک کتاب میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں " بہت سی تاریخی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرب معاشرے میں محتاج لوگوں کو بنیادی معاشی ضروریات یعنی غذا، لباس اور گھر کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے سودی قرضے دینے کا اس قدر رواج نہ تھا جس قدر کاروباری

مقاصد کے لیے سودی قرضے لینے دینے کا رواج تھا عرب تجارت پیشہ لوگ تھے قریش مکہ کے متعلق خود قرآن مجید میں ہے کہ مختلف موسموں میں ان کے تجارتی قافلے مختلف ملکوں میں جاتے اور خرید و فروخت کا کام دھندہ کرتے تھے اور اس میں تجارتی اور کاروباری مقاصد کے لیے سودی قرضے لینے دینے کا نیز مضاربت پر کام کرنے کرانے کا بھی رواج تھا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مقاصد کے لیے سودی قرضے دینے میں حضرت عباسؓ کو خاص شہرت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ خطبہ حجتہ الوداع ربوی کلیتاً تحریم کے اعلان کے موقع پر رسولؐ نے اپنے چچا عباسؓ کے ربا کے متعلق فرمایا کہ میں سب سے پہلے اس کو اپنے پاؤں تلے روندتا اور ختم کرتا ہوں اور فرمایا تائب ہونے کے بعد اب سودخواروں کے لیے صرف اور صرف وہ راس المال ہیں جو انھوں نے سودی قرض کے طور پر دیئے تھے ان پر زائد وہ کچھ نہیں لے سکتے ظاہر ہے کہ اس طرح کے اسلوب بیان کا تعلق عموماً ایسے لوگوں ہی سے ہوسکتا ہے جو قرض کا اصل مال لوٹانے اور ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہوں اور چوں کہ ایسی قدرت عام طور پر ایسے قرضداروں کو حاصل ہوتی ہے جو تجارتی کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ سامان تجارت بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم سے قرض کی اصل رقم ادا کر سکتے ہیں بلاشبہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو تجارت میں خسارہ اٹھانے کی وجہ سے اس قابل نہ ہوں کہ قرض کی اصل مبلغ وہ فوری طور پر ادا کر سکیں لہذا قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ جو مقروض تنگ دست ہو فوراً ادا نہ کر سکتا ہو اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے کہ وہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کے ذمے قرض کے مال کو اس کے لیے صدقہ کر دیا جائے یعنی معاف کر دیا جائے۔

قرآن مجید کی آیات ربا میں ربا کی جس تحریم کا واضح بیان ہے اس کا تعلق جس طرح نجی ضرورت کے صرفی قرضوں سے ہوسکتا ہے، اسی طرح تجارتی نوعیت کے

کاروباری قرضوں سے بھی ہے اس کا ثبوت شان نزول کی اس روایت سے فراہم ہوتا ہے، جس کو بہت سے مفسرین کرام نے سورۃ البقرہ کی آیات ربا کی تفسیر میں نقل اور بیان کیا ہے اس روایت سے ثابت اور ظاہر ہوتا ہے کہ، جس وقت تحریم ربا سے متعلق قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں اس وقت تجارت پیشہ بعض غنی و مال دار عرب قبائل کے مابین سودی قرض کا معاملہ موجود تھا۔ روایت کا مضمون کچھ اس طرح ہے قریش مکہ کے ایک قبیلہ بنوالمغیرہ کے کچھ افراد نے طائف کے قبیلہ بنو ثقیف کے بعض افراد سے سود پر قرض لے رکھا تھا اور یہ معاملہ ان کے درمیان زمانہ جاہلیت سے چلا آرہا تھا جو ان کے اسلام لانے کے بعد بھی اس وقت تک قائم رہا جب ۹ ہجری میں تحریم ربا کا اسلامی قانون کامل طور پر نافذ ہوا جس پر عمل کے نتیجہ میں دوسرے مسلمانوں کی طرح انھوں نے بھی ربا کا معاملہ ختم کر دیا البتہ انھیں اس میں کچھ تردد اور اختلاف ہوا کہ اب تک ربا کے نام پر مقروض جو مال ادا کر چکے ہیں قرض کے اصل مال سے منہا کر کے باقی مال واپس کیا جائے یا بغیر اس کے قرض کا اصل مال پورے کا پورا واپس کیا جائے، پھر جب ان کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق جو قرآنی آیت پر مبنی تھا قرض کا اصل مال پورے کا پورا ادا کیا جائے تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس روایت کے حوالے سے اصل بات جو عرض کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ روایت میں مذکور دونوں قبیلے تجارت پیشہ اور غنی و مال دار تھے لہذا ان کے درمیان سودی قرض کا یہ معاملہ صرف تجارتی اور کاروباری نوعیت کا ہی ہو سکتا ہے، بنیادی معاشی ضروریات کی خاطر سودی قرض کا معاملہ نہیں ہو سکتا جس کا تعلق محتاج و نادار افراد سے ہوا کرتا ہے، پھر جو لوگ عام عربوں اور خصوصاً قریش اور حضرت عباسؓ کی سخاوت اور مہمان نوازی کی روایتوں کا علم رکھتے ہیں، وہ بھی اس بات کو مان نہیں سکتے کہ عربوں کے اندر بنیادی حاجات کے محتاج افراد کو سودی قرض دینے کا عام رواج تھا، اور پھر قبائلی نظام میں کوئی قبیلہ اس

ذلت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ اس کے نادار اور محتاج افراد دوسرے قبیلہ کے افراد سے بنیادی ضروریات کے لئے سود پر قرض لیں اور زندگی گزاریں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش مکہ کے مال دار قبیلہ بنو المغیرہ کے کچھ افراد اپنے قبیلہ کے مال دار افراد کو چھوڑ کر طائف کے قبیلہ بنو ثقیف کے لوگوں سے نجی ضروریات کے لیے سود پر قرض لیں کیونکہ اس میں قبیلہ کی توہین ہے۔

غرض یہ کہ عرب معاشرے کے مخصوص حالات کے پیش نظر اور صدقات اور قرض حسن سے متعلق اسلامی تعلیمات جو تحریم ربا سے پہلے مسلمانوں میں رائج ہو چکی تھیں کے لحاظ سے یہ سمجھنا اور کہنا قرین عقل وقیاس اور صحیح لگتا ہے، کہ جب قرآن مجید میں تحریم ربا کی آیات نازل ہوئیں اور جب سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تحریم ربا کا اعلان فرمایا اس وقت وہ ربا خال خال اور شاذ ونادر ہی ہوگا جس کا تعلق غیر تجارتی اور کاروباری نوعیت کے قرضوں سے ہوتا ہے، زیادہ تر اور عموماً اس کا تعلق تجارتی اور کاروباری نوعیت کے قرضوں سے تھا۔

پھر جب کہ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ماضی میں تمام متمدن اقوام کے اندر تجارتی نوعیت کے سودی قرضوں کا رواج تھا بلکہ ان کے ہاں ایسے سودی قرضوں سے متعلق باقاعدہ قوانین تک موجود تھے۔ یونانیوں، رومیوں، مصریوں اور ہندوستان وغیرہ کے قدیم لٹریچر سے پتہ چلتا ہے، آج دنیا کے جن سرمایہ دار ممالک میں بینکاری کا نظام ہے، اس کا تو تمام تر تعلق تجارتی اور کاروباری نوعیت کے سودی قرضوں سے ہے، تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ تجارتی مقاصد کے لیے سودی قرضوں کا عہد نبوی کے عرب معاشرے میں رواج موجود نہ تھا جبکہ وہ سب مصلحتیں اور ضرورتیں اس میں بھی موجود تھیں جو اس قسم کے سودی قرضوں کے رواج کا باعث بنتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مذکورہ بالا حضرات کا یہ موقف ہے کہ قرآن مجید میں جس ربا کو حرام بتلایا

اور اس سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا اس کا تعلق تجارتی نوعیت کے قرضوں سے نہیں، دلائل کے لحاظ سے نہایت کمزور اور باطل موقف ہے، خود قرآن حکیم سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

پھر جس طرح یہ موقف کہ جس عرب معاشرے میں حضرت محمد ﷺ پر قرآن نازل ہوا اس میں تجارتی مقاصد سے تعلق رکھنے والے سودی قرضوں کا رواج نہ تھا، تاریخی حقائق کے لحاظ سے درست نہیں اسی طرح قانونی اور فقہی طور پر بھی درست نہیں کیونکہ یہ موقف تجارتی نوعیت کے قرضوں پر اس زیادتی کو حرام نہیں بلکہ حلال اور جائز قرار دیتا ہے، جو قرض دینے والا اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال پر وصول کرتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ مقروض اس مال کے ساتھ تجارت کر کے جو کماتا ہے، اس میں قرض دینے والے کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے، جو اس کے مال سے پیدا ہوا اور جس کا وہ حقدار تھا لہذا مقروض تاجر سے وہ جو زائد لیتا ہے، حلال و جائز ہونا چاہیے کیونکہ وہ اس میں کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اور نہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے، چنانچہ اس موقف کے حامی حضرات موجودہ رائج الوقت بینکاری نظام کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھتے اور نہ اس کو تبدیل کرنے میں کچھ دلچسپی رکھتے ہیں۔

موقف مذکور قانونی اور شرعی طور پر کیوں درست نہیں اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ یہ موقف معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کے جس تصور پر مبنی ہے، وہ معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کے اس تصور کے خلاف ہے، جو قرآن و حدیث میں ہے، اور جس کو اسلام نے اپنی معاشی تعلیمات اور اپنے حلال و حرام کے فلسفہ میں پوری طرح ملحوظ و مدنظر رکھا ہے، قرآن و حدیث میں معاشی حق کا جو تصور ہے اس کے مطابق کوئی شخص کسی معاشی شے کا حقدار اور مالک دو وجہ سے قرار پاتا ہے، ایک وجہ ہے انسان کی دماغی جسمانی سعی و محنت جو اس نے کسی قدرتی شے میں نئی افادیت پیدا کرنے کیلئے صرف کی

ہو اور دوسری وجہ تبادلے کی صورت میں وہ حقیقی رضامندی ہے، جو ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا صحیح بدل اور عوض موجود ہونے کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔ تجارتی لین دین اور معاوضے کے معاملے میں جب ہر فریق کیلئے اس کے مال کا قدر و قیمت کے لحاظ سے مساوی اور برابر عوض موجود ہو تو اس میں معاشی عدل پایا جاتا ہے، اور جب معاملہ کے ایک فریق کیلئے اس کے مال کا سرے سے کوئی عوض و بدل موجود نہ ہو یا برابر و مساوی بدل و عوض موجود نہ ہو بلکہ ناقص عوض موجود ہو تو اس میں ظلم و استحصال ہوتا ہے، عدل کی شکل میں معاملہ شرعاً اور قانوناً جائز اور ظلم کی شکل میں حرام و ناجائز قرار پاتا ہے۔

چنانچہ معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کے اس تصور کی روشنی میں اس زیادہ مال کا جائزہ لیا جائے جو تجارتی نوعیت کے قرضوں میں قرض خواہ قرض کے اصل مال پر مقروض سے لیتا ہے، وہ زائد مال اس کا حق نہیں ہوتا، کیونکہ نہ اس کے پیچھے اس کی کوئی دماغی، جسمانی محنت و مشقت ہوتی ہے، اور نہ مقروض کے لیے اس کے برابر کوئی دوسرا مال ہوتا ہے، لہذا وہ بغیر کسی مساوی عوض و بدل کے دوسرے کا مال ناحق طور پر لیتا ہے، جس کی قرآن مجید میں واضح طور پر ممانعت ہے، سورۃ النساء کی آیت ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ لو،

بعض مفسرین حضرات نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے باطل کی تعریف لکھی ہے: **الباطل ھو کل مایؤخذ من الانسان بغیر عوض۔**

کسی انسان سے اس کا مال بغیر عوض کے لینا باطل ہے،

رہا مذکورہ موقف کے حامیوں کا یہ کہنا کہ مقروض تجارت کی غرض سے لئے ہوئے قرض کے مال کے ساتھ کاروبار کر کے جو نفع کماتا ہے، اس میں قرض دینے

والے کا حصہ اور حق ہوتا ہے، شریعت اور قانون کی رو سے بالکل غلط بات ہے، اگر ان
کے ذہن میں قرض اور امانت کی شرعی اور قانونی حقیقت واضح ہوتی اور اس فرق پر ان
کی نظر ہوتی جو قرض اور امانت کے مابین پایا جاتا ہے، تو یہ کبھی بھول کر بھی ایسی بات نہ
کہتے، بہر حال یہ ایک متفقہ حقیقت ہے کہ قرض کے معاملہ میں قرض کا مال قرض دینے
والے کی ملکیت سے نکل کر قرض لینے والے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا اور اس مال کی
حیثیت ہر لحاظ سے ٹھیک ویسی ہی ہو جاتی ہے، جو مقروض کے کسی دوسرے ذاتی مال کی
ہوتی ہے مقروض کو اس میں ہر تصرف اور ردو بدل کا ٹھیک ویسا ہی اختیار ہوتا ہے، جیسا
کہ اس کو اپنے کسی دوسرے ذاتی مال میں تصرف اور ردو بدل کا اختیار ہوتا ہے، چنانچہ
جس طرح وہ اپنے کسی دوسرے ذاتی مال کے ساتھ کاروبار سے حاصل شدہ پورے منافع
کا حقدار ہوتا ہے، اسی طرح وہ اس قرض کے مال کے ساتھ کاروباری محنت و مشقت
کے ذریعے جو منافع کماتا ہے اس کا بھی وہ بلا شرکت غیر خود حقدار ٹھہرتا ہے، قرض دینے
والے کے متعلق شرعاً اور قانوناً مقروض کی صرف ایک ذمہ داری ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ
مقررہ وقت پر قرض کے مال کی مثل ادا کرے، قرض دینے والا اس کے سوا اور کسی چیز کا
مستحق نہیں ہوتا اس کو اس سے کچھ سروکار نہیں کہ مقروض نے مال قرض سے فائدہ اٹھایا یا
نقصان یا اس کے پاس سے وہ مال چوری یا کسی ارضی سماوی آفت کی وجہ سے ضائع ہو
گیا وہ ہر حال میں اپنے اصل مال کی مثل واپس لینے کا حقدار ہوتا ہے، بخلاف امانت
کے معاملہ کے کہ اس میں امین کے پاس بطور امانت جو مال ہوتا ہے وہ اس کی ملکیت
نہیں بلکہ امانت والے کی ملکیت میں رہتا ہے، چنانچہ اگر کبھی کسی غیر اختیاری سبب
مثلاً ارضی سماوی آفت سے تلف اور ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان امین پر نہیں آتا اس کا
تمام تر بوجھ امانت والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے معاملہ
مضاربت کی مثال لیجیے کہ اس میں رب المال کا جو مال عامل مضارب کے پاس ہوتا

ہے، وہ قرض کے طور پر نہیں بلکہ امانت کے طور پر ہوتا ہے، چنانچہ اگر کبھی کسی حادثہ میں غیر اختیاری طور پر ضائع ہو جائے یا تجارت میں اتنا خسارہ ہو کہ اصل سرمایہ بھی محفوظ نہ رہے تو اس کا تمام تر مالی نقصان تنہا رب المال کو برداشت کرنا پڑتا ہے، عامل مضارب اس میں شریک نہیں ہوتا چنانچہ یہی وہ چیز ہے جو نفع کی صورت میں رب المال یعنی مال والے فریق کیلئے نفع کے ایک مقرر حصے کو لینے کا جواز پیدا کر دیتی ہے، یہ ایک فقہی اور عقلی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا نقصان برداشت کرتا ہے وہ اس کا فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے، الغنم بالغرم اور الخراج بالضمان کا یہی مطلب ہے، اور چونکہ قرض کی صورت میں قرض دینے والا مال قرض میں کوئی نقصان برداشت نہیں کرتا لہذا مال قرض پر کچھ بھی زائد مال نہیں لے سکتا، یہ قاعدہ عدل وانصاف اور عقل وقیاس کے عین مطابق ہے۔

اور چونکہ زیر بحث تجارتی نوعیت کے قرضوں میں یہ طے ہوتا ہے، کہ قرض خواہ کو قرض کی اصل رقم ضرور ادا کرے گا خواہ وہ اس کے پاس کسی وجہ سے ضائع ہی کیوں نہ ہوگئی ہو گویا وہ اصل رقم میں کوئی نقصان برداشت کرنے کی ضمانت نہیں دیتا لہذا وہ کسی نفع کا بھی مستحق قرار نہیں پاتا چنانچہ وہ قرض کے اصل مال پر جو بھی زائد مال لیتا ہے، وہ اس کا حق نہیں بلکہ قرض دار کا حق ہوتا ہے اور کسی کا حق مارنے کا دوسرا نام معاشی ظلم واستحصال ہے۔

علاوہ ازیں موقف مذکور کے غلط ہونے کی ایک اور وجہ یہ کہ اس موقف کے حامی تجارتی قرضوں پر جواز سود کے اس وجہ سے قائل ہیں، کہ مقروض شخص اس مال کے ساتھ تجارت کرتا اور نفع کماتا ہے، لہذا اس میں سے ایک حصہ قرض خواہ کو مل جانا مقروض کی حق تلفی کا باعث نہیں بنتا جو حرام وناجائز ہے، حالانکہ یہ حضرات اس کو بھول جاتے ہیں کہ تجارت میں ہمیشہ نفع نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات نفع تو درکنار اصل سرمایہ ہی خسارے کی لپیٹ میں آجاتا ہے، لیکن مذکورہ موقف کے مطابق ایسی صورت

میں بھی مقروض پر لازم ہوتا ہے کہ قرض کا اصل مال بمعہ مقررہ سود کے ادا کرے بتلایئے ایسی صورت میں قرض خواہ قرض کے اصل مال پر بطور سود جو زائد مال لیتا ہے اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ یہ کس منافع کا ایک حصہ ہوتا ہے؟ علاوہ ازیں یہ سمجھنا کہ کاروبار میں جو منافع حاصل ہوتا ہے اس کا ایک حصہ تاجر کی محنت و مشقت سے اور دوسرا اس میں لگے ہوئے سرمائے سے پیدا ہوتا ہے، حقیقت واقعہ کے لحاظ سے بالکل غلط و باطل ہے، کیوں کہ سرمایہ کسی شکل میں اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مال کو پیدا نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا ہے، کوئی مال کسی مال سے نہیں بلکہ صرف انسانی عمل اور جہد سے پیدا ہوتا ہے، مثال کے طور پر مال کی ایک قسم زر و نقدی اور سونے چاندی کو لیجیے آپ سو سال تک کسی محفوظ جگہ مثلاً تجوری میں رکھیے جب نکالیں گے تو اس میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا، اگر سرمایہ یعنی مال نباتات وحیوانات یا ان سے حاصل اور تیار کردہ مختلف سرو سامان اور اشیاء کی شکل میں بے کار پڑا ہو تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کہنگی کے ذریعے بتدریج تحلیل ہوتا اور اپنی قدر و قیمت کھوتا چلا جاتا ہے، از خود اس میں اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے کبھی کوئی اضافہ ظہور میں نہیں آتا، یہ وہ کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا ہر انسان اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اس کے ثبوت کے لیے کسی عقلی و نقلی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ جب کوئی مال کسی بھی شکل میں کسی کاروبار میں استعمال ہوتا اور راس المال و سرمایہ کہلاتا ہے، تو وہ سرمایہ اپنی اصل شکل میں قائم نہیں رہتا کبھی ایک شکل سے دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے، مثلاً تجارت میں سکہ رائج الوقت کی شکل میں جو زر و نقدی ہوتی ہے وہ مختلف قسم کی تجارتی اشیاء اور سرو سامان کی شکل سے بدل جاتی ہے اور خرید و فروخت کا دھندہ ختم ہونے کے بعد پھر عموماً حسب سابق زر و نقدی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، صنعتی کاروبار ہو تو زر و نقدی مختلف قسم کے صنعتی ساز و سامان کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے جس میں اوزار، مشینیں، خام مواد

ایندھن جیسے تیل، کوئلہ، گیس، بجلی وغیرہ شامل ہیں، اور پھر مختلف قسم کی مصنوعات اور تیار اشیاء کی شکل میں سامنے آتی اور بالآخر پھر سکہ رائج الوقت زرونقدی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ سرمایہ جب کاروبار میں استعمال ہوتا ہے تو اپنی اصل شکل پر جوں کا توں برقرار نہیں رہتا بلکہ ضرور تبدیل ہوتا ہے، لیکن استعمال ہونے سے اس میں جو تبدیلی آتی ہے اس تبدیلی کے اثرات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اوزار اور مشینیں استعمال ہونے سے گھستی اور ان کی قیمت و مالیت برابر گھٹتی اور کم ہوتی چلی جاتی ہے، ایندھن جل کر ختم ہو جاتا ہے، خام مواد، تیار مال اور مصنوعات کی شکل اختیار کر لیتا ہے، غرض یہ کہ کاروبار میں لگا ہوا سرمایہ خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو استعمال ہونے سے فنا اور ضائع نہیں ہوتا بلکہ بعض شکلوں میں جزئی اور بعض شکلوں میں کلی طور پر تحلیل ہو کر کارخانے کی ہونے والی پیداوار میں شامل ہو کر اس کے حجم کو کمیت و مقدار کے لحاظ سے بڑھا دیتا ہے، لیکن اس کا کسی طرح یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سرمائے نے پیداوار کے ایک حصہ کو پیدا کیا کیوں کہ یہ مطلب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب سرمایہ اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے کسی نئی چیز کے وجود کا سبب و ذریعہ بنے حالانکہ کاروبار میں استعمال ہونے والا سرمایہ اپنے اصل وجود کے ساتھ قائم و برقرار نہیں رہتا جیسا کہ عام مشاہدہ ہے تو پھر یہ سمجھنا کہ کسی صنعتی کاروبار میں حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک حصے کو سرمائے نے پیدا کیا خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے بالکل غلط اور باطل ہوتا ہے، پیداوار تمام تر انسانی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کی وضاحت کے لیے ایک چھوٹی سی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ درزی جب بغیر سیونگ مشین کے ہاتھ کے ساتھ کپڑے سیتا ہے دن بھر میں بمشکل دو تین کپڑے سی پاتا ہے، لیکن جب سیونگ مشین کے ساتھ سیتا تو زیادہ تعداد میں سی لیتا ہے، تو اس سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ ان میں سے کچھ کپڑے درزی کی محنت نے اور کچھ سیونگ مشین نے سینے اور تیار کیے اور

چوں کہ مشین سرمائے کی تعریف میں آتی ہے لہذا مطلب یہ ہوا کہ کچھ کپڑے درزی کی محنت سے تیار ہوئے اور کچھ کو مشین کی شکل میں سرمایہ نے پیدا کیا لیکن گہری نظر سے بغور دیکھا جائے تو مطلب مذکور غلط نظر آتا ہے، کیوں کہ درحقیقت مشین کے ساتھ کام کرنے کی صورت میں پیداوار میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کی وجہ کاریگر کی نئی محنت کے اثرات کے ساتھ پرانی محنت کے کچھ اثرات کا شامل ہو جانا ہے، جو بے شمار انسانوں کی دماغی جسمانی سعی و محنت سے وجود میں آئے اور مشین کی شکل میں منتقل ہوئے، مشین ایک قدرتی دھات ہے جس کو کان سے نکالنے اور موجودہ شکل دینے تک بے شمار انسانوں نے بلاواسطہ اور بالواسطہ مختلف قسم کے کام انجام دیئے لہذا اس وقت اس مشین کی جو قدر و قیمت اور جو مالیت ہے، وہ اس دھات کی نہیں جس سے وہ مشین بنی ہے بلکہ سعی و محنت کے ان اثرات کی ہے، جو مشین کی صورت میں منتقل ہو کر سامنے آئے چنانچہ جب مشین کاروبار میں استعمال ہوتی ہے تو کچھ اثرات اس سے جدا ہو کر نئی محنت کے اثرات میں شامل ہو جاتے اور پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، لیکن اس اضافے سے دوسری طرف مشین کی مالیت و قیمت میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ کمی واقع ہوتی ہے جس کا معاوضہ کارخانہ دار مجموعی آمدنی میں سے وصول کرنا اپنا حق سمجھتا اور اس کو ضرور حساب میں لاتا ہے، گویا اس کے نزدیک گھسنے سے مشین کی مالیت میں جو کمی واقع ہوتی وہ نئی پیداوار میں منتقل و شامل ہو جاتی ہے ، حاصل بحث یہ کہ کسی بھی صنعتی کاروبار میں جو سرمایہ استعمال ہوتا ہے، وہ اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا بلکہ جزوی یا کلی طور پر تحلیل و تبدیل ہو کر اس پیداوار میں شامل ہو جاتا ہے جو کاریگروں اور مزدوروں کی دماغی جسمانی سعی و محنت سے وجود میں آتی ہے اور اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

دراصل یہاں دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن عام طور پر ایک ظاہر بین سطحی نظر

رکھنے والا شخص اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتا جو ان چیزوں کے مابین پایا جاتا ہے لہذا وہ بھٹک جاتا ہے مطلب یہ کہ ایک چیز ہے ہر کاروبار کے لئے کسی نہ کسی شکل میں سرمائے کے وجود کا ضروری ہونا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی ہوشمند شخص انکار نہیں کر سکتا اور دوسری چیز ہے سرمائے کا کسی مال کو پیدا کرنا ان دو چیزوں میں عقلی اور واقعی طور پر کوئی تلازم نہیں مثال کے طور پر ایک بیج کو لیجیے جو درخت کے لیئے بہر حال ضروری ہوتا ہے، لیکن وہ درخت کو پیدا کرنے والا نہیں ہوتا چناں چہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بیج سے درخت پیدا ہوا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ بیج نے اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے درخت کو پیدا کیا کیوں کہ وہ خود فنا ہو جاتا ہے۔

پھر چوں کہ ہر آدمی اس باریک فرق کو سمجھ نہیں پاتا جو ایک چیز کے دوسری چیز کے لیے ضروری ہونے اور ایک چیز کے دوسری چیز کو پیدا کرنے، کے مابین پایا جاتا ہے لہذا وہ اس دھوکے اور مغالطے میں مبتلا ہو جاتا ہے، کہ سرمایہ چونکہ کاروبار کرنے کے لیے ضروری ہے لہذا وہ پیدا آور عامل بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی سرمایہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا جیسا کہ اوپر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لہذا یہ نظریہ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط اور باطل ہے، کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی مال و دولت کو پیدا کرتا ہے، اس کی غلط اور باطل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس نظریہ کو صحیح مانتے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، آج تک یہ طے نہیں کر سکے اور یقیناً آئندہ بھی کبھی نہ کر سکیں گے کہ کسی کاروبار میں جو منافع ہوتا ہے اس کا کتنے فیصد سرمائے سے اور کتنے فیصد محنت سے پیدا شدہ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کا تعین نہ ہو تو معاملے میں عدل کی صورت کا تعین ناممکن ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو سرمایہ دار ممالک میں سرمایہ دار اور محنت کش کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش اور آویزش پائی جاتی ہے، وہ نتیجہ ہے اس اندھے بہرے

مبہم و مجہول تصور اور نظریے کا کہ سرمایہ بھی دولت پیدا کرتا ہے، لہٰذا اس کی آڑ میں
سرمایہ دار کو جو عموماً برتر و بالا پوزیشن میں ہوتا ہے محنت کش کے استحصال کا خوب موقع ملتا
ہے اور اس کی کمزور حیثیت سے وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح حکومتی قوانین چوں
کہ سرمایہ داروں کی مرضی سے بنتے ہیں لہٰذا انہی کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

اور چونکہ نظریہ مذکور حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط و باطل اور عدل وانصاف
کے سراسر منافی ہے، لہٰذا دین اسلام سے جو حقیقت پسند اور عدل وقسط کا دلدادہ ہے اس کا
کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا، اس کو اسلام کے حوالے سے صحیح کہنا اسلام پر تہمت لگانا
اور بری طرح بدنام کرنا ہے، لیکن افسوس کہ بہت سے سطحی، کم علم اور کم فہم لوگ اس
گمراہی میں خود مبتلا اور دوسروں کو گمراہ کر رہے ہیں اللہ ہی ان کو ہدایت دے۔ (آمین)

امید ہے اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تجارتی قرضوں پر سود
(کمرشل انٹرسٹ) کو جائز کہنا کس قدر بڑی غلطی ہے اور یہ کہ جس موہوم نظریہ پر اس
کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ کس قدر غلط، مغالطہ آمیز اور شر انگیز ہے۔

....

شراکت یا مشارکہ کیا ہے؟

سوال ۲: ایک مسئلہ جدید کاروباری حوالہ سے معلوم کرنا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے شہر میں اسلامی بنک کے لوگ آئے تھے یہاں انہوں نے ایک بریفنگ دی جس میں انہوں نے بتایا کہ اسلامی بنک شراکت کا کاروبار کرنے کے لئے سرمایہ کاری قبول کرے گا اور شراکت پر سرمایہ کاری کے لئے سرمایہ جاری کرے گا۔ براہ کرم شراکت کے بارے میں کچھ تفصیلات مہیا فرمائیں۔ اور بنک کے ساتھ کس طرح شراکت کی جا سکتی ہے۔

(محمد ارشاد عارف، پشاور)

جواب: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین اسلامی بنک کے ساتھ سرمایہ کاری کے سلسلہ میں شرکت العقد کا معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ اور آج کل شرکت العقد ہی زیادہ معروف ہے اگرچہ شرکت کی متعدد اقسام ہیں: شرکت کیا ہے؟ فقہ اسلامی میں شرکت کی مختلف تعریفیں فقہاء اسلام نے بیان کی ہیں۔ فقہ حنفی کے مطابق شرکت سے مراد ہے۔ **اختصاص اثنین فاکثر بمحل واحد** یعنی دو یا زیادہ افراد کا ایک محل عقد سے مخصوص ہو جانا۔ (فتاویٰ التاتارخانیہ جلد ۵ ص ۶۲) جبکہ جدید معاشی نظام میں شرکت کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔

Two, three or more people combine, contribute, capital and agree to share profits and bear losses in agreed propertions (Modern Economic Theory by K.K.Dewit.)

یعنی دو تین یا اس سے بھی زیادہ افراد اس طرح سرمایہ کاری کریں کہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے حساب سے نفع و نقصان میں شریک ہوں۔

شراکتی کاروبار جسے آج کل اسلامی بنکاری کی اصطلاح میں مشارکہ کہا جاتا ہے اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اسکی فضیلت اور اسکی کامیابی کی ضمانت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ **ید اللہ مع الشریکین مالم یتخاونا فاذا تخاونا محقت تجارتھما فرفعت البرکۃ منھا**۔ (سنن ابی داود)

یعنی شراکتی کاروبار کرنے والوں پر اللہ کا ہاتھ رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ اس میں باہمی خیانت کے مرتکب نہ ہوں اور اگر وہ خیانت کا ارتکاب کریں تو ان کی تجارت ختم ہو کر رہ جائے گی اور برکت اٹھ جائے گی۔

شرکت یا مشارکہ کا طریق جو مختلف اسلامی بنکوں نے عموماً اختیار کیا ہے وہ سودی قرضوں سے بچنے کے لئے ہے۔ کیونکہ اسلامی بنکاری سے قبل کنونشنل بنک تاجروں، صنعتکاروں اور دیگر ضرورتمندوں کو مختلف منصوبوں، تجارتی سودوں اور نئی انڈسٹری وغیرہ لگانے کے لئے سود پر سرمایہ مہیا کرتے تھے اور خود کاروبار میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے۔ اسلامی بنکاری میں یہ ہوا ہے کہ اب بنک قرض جاری کرنے کی بجائے خود کاروبار میں بحیثیت شریک شامل ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار جو ہمیں معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ کاروبار کے لئے شراکت کی بنیاد پر بنک کو سرمایہ کاری کی دعوت کوئی بھی کمپنی یا کاروباری ادارہ یا تاجر یا شخص دے سکتا ہے اور یہ دعوت ایک درخواست کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس درخواست کے ساتھ کمپنی یا شخص اس کاروبار کی وضاحت پر مشتمل پوری ایک سمری پیش کرتا ہے اور اگر کوئی نیا پراجیکٹ شروع کرنا ہو تو اس کی فزیبلیٹی رپورٹ بھی ساتھ منسلک کرنا ہوتی ہے جس میں تمام تر تفصیلات موجود ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں پراجیکٹ اگر انڈسٹری کا ہے تو اس کے ساتھ جگہ کا تعین اور جگہ اگر اس کے پاس ہے تو

اس کے ملکتی کاغذات وغیرہ منسلک کرنا ہوتے ہیں۔ اور دیگر دستاویزات جو بنک کو بحیثیت شریک اطمینان کے لئے درکار ہوں مہیا کی جاتی ہیں۔ بنک ان تمام دستاویزات کی جانچ پڑتال کے بعد اگر مطمئن ہو تو سرمایہ کاری کی حد متعین کرتا ہے کہ وہ کس حد تک سرمایہ کاری کرنے پر رضامند ہے۔ باہمی رضامندی سے طے شدہ سرمایہ کاری کے معاہدہ کا باقاعدہ شکل دی جاتی ہے اور اس طرح شرکت متناقصہ کا ایک معاملہ طے پاجاتا ہے۔ جس میں منافع کی تقسیم کا فارمولا شرعی احکام کے مطابق باہمی رضامندی سے طے ہوتا ہے اور نقصان راس المال کے لحاظ سے طے پاتا ہے۔ (Capital) بنک اس کاروبار میں اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو وہ اس کی تفصیلات بھی طے کرتا ہے کہ وہ اپنا حصہ تدریجاً یا جزئیاً یا کلیاً کس طرح فروخت کرے گا۔

شرکت متناقصہ کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ معاہدہ میں مذکور مدت کے اختتام پر بنک اپنا حصہ کسی اور کو فروخت کردے (یا حصہ دار کو) اور کسی اور کمپنی یا شخص کو اس کمپنی یا شخص کا حصہ دار/شریک بنادے۔

۲۔ یا منافع کو تین حصوں میں تقسیم کردے۔ ایک حصہ بنک کے لئے، دوسرا حصہ اس کاروبار سے بنک کے اصل سرمایہ کی وصولی کے لئے اور تیسرا حصہ کاروبار میں شریک کمپنی یا شخص کے لئے مختص کردے۔

۳۔ راس المال کے مختلف حصے (Shares) بنادیے جائیں ہر حصہ کی ایک قیمت مقرر کردی جائے جس میں اصل زر اور حاصل شدہ منافع شامل ہو۔ اور یہ شیئرز بنک کے ساتھ شریک کاروباری کمپنی یا شخص جس نے بنک کو سرمایہ کاری میں شریک کیا تھا ہر سال تھوڑے تھوڑے کرکے اس طرح خریدتا رہے کہ بنک کا حصہ کم ہوتا چلا جائے تا آنکہ وہ کمپنی یا شخص کل سرمایہ کا مالک بن جائے۔ (ڈاکٹر عزالدین خوجہ نے اپنی کتاب ادوات استثمار الاسلامی میں ص ۱۰۶ سے ۱۰۹ میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں)

شرکت متناقصہ شرعاً درست ہے کہ یہ شرکت عنان ہی کی ایک صورت ہے کہ اس میں دونوں شریک اپنا اپنا سرمایہ (راس المال) لگاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے وکیل کے طور پر کام کرتے ہیں اور ادارتی امور بنک عموماً اپنے شریک (کمپنی) کو تفویض کرتا ہے اور خود کاروبار میں سلیپنگ پارٹنر کا کردار ادا کرتا ہے۔

شرکت عنان کی تعریف فقہاء نے یوں بیان کی ہے۔ علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں: دو یا زیادہ افراد کسی (معاملہ یا کاروبار میں) اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کا سرمایہ، عمل، حقوق مساوی نہ ہوں۔ اس میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے۔ کفیل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر زید اور عمر نے شرکت کی اور اس میں زید ایک ہزار روپے اور عمر ڈیڑھ ہزار روپے لگائے اور منافع بھی اسی تناسب سے طے پائے تو یہ شرکت عنان ہوگی۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، از علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی، طبع بیروت وکراچی جلد ۶ ص ۵۶)

جبکہ سرمایہ برابر برابر لگانے اور مال میں، حقوق تجارت میں، کام اور منافع میں شرکاء برابری پر ہوں اور ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل ہو تو یہ شرکت، شرکت مفاوضہ کہلائے گی۔

صورت مسئولہ میں بنک کا سرمایہ کاری کی شراکت کی بنیاد پر پیش کش کرنا اسلامی تجارت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اور بنک کے ساتھ شرکت عنان، شرکت متناقصہ، شرکت عقود کا معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مضاربت بھی ہو سکتی ہے۔

....

شرکتِ املاک یا شرکت عقود

سوال ۳: مکانوں کی تعمیر کے لئے پہلے کمرشل بنک سودی قرضے جاری کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں مگر اب مختلف اسلامی بنک قرضوں کی بجائے شراکت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے سرمایہ کاری کرتے ہیں اور سود سے بچنے اور بچانے کے لئے شرکت املاک یا شرکت عقود کی بناپر شراکت کرتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ یہ شرکت املاک یا شرکت عقود کیا ہے؟ براہ کرم تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: اسلامی بنکوں کا سودی قرضوں کی بجائے شرکت یا مشارکہ کرنا اچھی روایت ہے اور یہ اسلامی اصول تجارت میں سے ہے۔ فقہاء نے شرکت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

الشركة ضربان شركة املاك وشركة عقود (الهداية ج ۲ ص ۶۰۴)

۱۔ شرکت املاک ۲۔ شرکت عقود

شرکت املاک کی تعریف فقہا کے ہاں یہ ہے: **شركة الاملاك العين يرثها رجلان ويشتريانها (الهدايه ج ۲ ص ۶۰۴)**

یعنی شرکت املاک ایسے مال عین میں ہے جس کے دو شخص وارث ہوں دونوں اس کو خریدیں۔ ہدایہ ہی میں ہے کہ شرکت املاک، ملکیت کی شرکت کو کہتے ہیں وہ اس طرح کہ چند آدمیوں کو وراثت میں یا بطور ہبہ ایک جائیداد یا نقد روپیہ ملا یا دو دونوں غلبہ کی صورت میں اس کے مالک بن جائیں، یا دو آدمیوں نے مل کر کوئی چیز خریدی تو یہ تمام صورتیں شرکت املاک کی ہیں۔ ان صورتوں میں دونوں کو چیز کی ملکیت میں

شریک تصور کیا جائے گا۔ (الہدایہ ج ۲ ص ۶۰۲ نیز فتح القدیر ج ۵ ص ۳۷۷)۔

احناف کے نزدیک شرکت املاک کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے کہ دو شخص ایک چیز کے مالک بن جائیں اور ان میں کسی قسم کا شرکت کا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۱)

واضح ہو کہ شرکت املاک کی پھر دو قسمیں ہیں

(۱) ایک قسم وہ ہے جو دونوں شریکوں کے کام کرنے سے ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسے زید اور عمر نے مل کر کوئی چیز خریدی یا ان دونوں کو کوئی چیز کسی نے ہبہ کر دی، یا ان دونوں کے حق میں کسی نے وصیت کی یا ان دونوں کو کوئی چیز بطور صدقہ ملی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس طرح ملنے والی کوئی چیز ان دونوں کے مابین اس طرح مشترک ہوگی کہ وہ دونوں ملکیت میں شریک ہوں گے۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۵۶)

(۲) جبکہ دوسری قسم وہ ہے جو دونوں کے کام کرنے کے بغیر بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ وراثت کے ذریعہ اگر کوئی چیز دونوں کو ملی تو وہ دونوں اس کے وارث ہو جائیں گے۔ اور یہ موروثی چیز ان دونوں کے درمیان اس طرح مشترک ہوگی کہ وہ دونوں ملکیت میں شریک ہوں گے۔ (بدائع الصنائع ج ۵۶)

اسلامی بنک جب شرکت املاک کرتے ہوئے کسی شخص کے ساتھ مکان کی خریداری میں شراکت کرتے ہیں تو اس میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ اس مکان کی مالیت کیا ہے جس مالیت پر مکان خریدا گیا اس میں بنک اور مکان کا طلبگار شریک ہو جاتے ہیں اور اس مالیت کی مساوی قسطیں مقرر کر لی جاتی ہیں۔ بنک اپنے شریک شخص کو ان قسطوں میں فروخت کرتا رہتا ہے اور اس طرح بنک کی ملکیت کم ہوتی رہتی ہے جبکہ دوسرے شریک کی ملکیت بڑھتی رہتی ہے اور بالآخر وہ مکان کا مالک بن جاتا ہے۔

شرکت عقود کا تعلق عقد سے ہے اور عقد بمعنی معاہدہ یا (Agreement) ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شرکاء آپس میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے بندھ جائیں اور اس معاہدہ کی شرائط جو خود انہی نے طے کی ہیں کے پابند ہو جائیں۔

ہدایہ میں ہے **والضرب الثانی شرکة العقود ورکنها الایجاب والقبول وهو ان یقول احدهما شارکتک فی کذا وکذا ویقول الآخر قبلت** (الهدایه ج ۲ ص ۶۰۴)

ترجمہ: دوسری قسم شرکت عقود ہے اور اس کا رکن ایجاب وقبول ہے اور وہ اس طرح کہ ایک شریک یہ کہے کہ میں نے تجھ سے فلاں چیز میں شرکت کی اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔

اگرچہ شرکت عقود کا اقرار و معاہدہ زبانی بھی ہوسکتا ہے جیسے نکاح کا اقرار و معاہدہ تاہم اس ایجاب وقبول کو فی زمانہ بنک یا کمپنیاں تحریری معاہدوں کی صورت میں طے کرتی ہیں۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تو تحریر ہی کے قائل ہیں اور اس کو لازم سمجھتے ہیں چنانچہ المبسوط میں ان کا یہ قول درج ہے: **ان الکتابة عقد ارفاق** ۔ (لکھ لینا معاہدہ کو مضبوط کرتا ہے)

شرکت عقود میں شرط یہ ہے کہ شرکت عقود کا معاہدہ قابل وکالت ہونا چاہئے۔

ہدایہ میں ہے: **ان یکون التصرف المعقود علیه عقد الشرکة قابلا للوکالة لیکون مایستفاد بالتصرف مشترکا بینهما فیتحقق حکمه المطلوب منه** (الهدایة ج ۲ ص ۶۰۴)

یعنی: جس تصرف پر شرکت کا عقد و معاہدہ ہوا ہے وہ قابل وکالت ہو، تاکہ تصرف سے جو کچھ حاصل ہو وہ دونوں میں مشترک ہو، اور شرکت کے عقد سے جو حکم مطلوب تھا وہ ثابت ہو جائے۔

شرکت عقود کے بعض بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عقد تحریراً ہونا چاہئے تا کہ بوقت ضرورت اس سے مدد لی جا سکے۔

۲۔ منافع کی تقسیم کی مقدار بھی صاف صاف بیان کی جانی چاہئے کہ کتنا کس کو ملے گا۔

۳۔ ہر شریک مشترکہ مال میں امین ہوگا اور امین کی حیثیت سے مال کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہوگی۔

۴۔ ہر شریک مشترکہ مال میں وکیل کی حیثیت رکھے گا۔ وکیل کی حیثیت سے ہر ایک کو کاروبار کے انتظام اور تصرف میں برابر کا اختیار حاصل ہوگا۔

۵۔ کام اور سرمایہ برابر ہونے کی صورت میں بھی اگر باہمی رضامندی سے یہ طے ہو جائے کہ ایک آدمی کو زیادہ اور ایک کو کم نفع ملے گا تو ایسا طے کرنا درست ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ (کذافی الہدایہ ج ۲ ص ۶۰۶)

۶۔ شرکت عقد میں عاقد خود یا اپنے نمائندہ کے ذریعہ کام میں شریک رہے گا۔ لیکن اگر کسی سبب سے شریک نہ رہ سکتا ہو تو منافع اور نقصان میں شریک ہوگا۔ کیونکہ کام مال یا ضمان میں سے کسی صورت بھی شراکت ہو تو منافع کا مستحق ہوتا ہے۔ (کذافی الہدایہ ج ۲ ص ۶۰۹)

۷۔ اگر معاہدہ میں کسی فریق نے شرط رکھی کہ وہ کام میں شریک نہیں ہوگا تو شرکت عقد اس کے حق میں فاسد ہوگی۔

شرکت عقد کے چند بنیادی اصول حسب ذیل ہیں ان کے علاوہ بھی شرکت عقد میں اقسام کے لحاظ سے الگ الگ اصول متعین ہیں۔

شرکت عقد کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں

۱۔ شرکت مفاوضہ　　۲۔ شرکت عنان

۳۔ شرکت صنائع　　۴۔ شرکت وجوہ

احناف کے نزدیک شرکت عقود کی یہی چار قسمیں ہیں البتہ علامہ کاسانی نے شرکت عقود کی تین قسمیں بتائی ہیں اور وہ ہیں شرکت اموال، شرکت اعمال، اور شرکت وجوہ۔ پھر ان کے نزدیک شرکت اعمال میں شرکت ابدان، شرکت صنائع اور شرکت قبول آجاتی ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی نے شرکت عقود کی چھ قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ شرکت اموال مفاوضہ
۲۔ شرکت اموال عنان
۳۔ شرکت اعمال مفاوضہ
۴۔ شرکت اعمال عنان
۵۔ شرکت وجوہ مفاوضہ
۶۔ شرکت وجوہ عنان

(دیکھئے بدائع الصنائع ج ۶ ص ۵۶)

آج کل بنک شرکت ملک اور شرکت عقود کے ذریعہ House Financing کرتے ہیں اور اگر معاہدہ اسلامی روح کے مطابق ہو تو ان دونوں طریقوں سے بنک کیساتھ مشارکت کرکے مکان بنانے یا خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

....

بیع مرابحہ

س ۴: محترم جناب ڈاکٹر شاہنواز صاحب درج ذیل مسئلہ میں آپ کے مجلہ کے توسط سے رہنمائی درکار ہے براہ کرم جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اس مسئلہ کے بارے میں روشنی ڈالیں کہ زید نے بنک سے قرض مانگا کہ وہ ایک ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے مگر بنک نے اسے نقد رقم فراہم کرنے کی بجائے یہ کہا کہ بنک اسے ٹریکٹر خرید کر دینے کو تیار ہے۔ وہ بازار سے ٹریکٹر کی قیمتیں معلوم کرلے اور خریداری کے لئے مطلوبہ رقم کی مقدار بتائے تو اسے ٹریکٹر دلوایا جا سکتا ہے۔ زید نے ٹریکٹر کی قیمتیں معلوم کیں اور جو ٹریکٹر اسے پسند تھا اس کی تفصیلات بنک کو بتادیں۔ بنک نے زید سے کہا کہ چونکہ بنک کاروباری ادارہ ہے اس لئے وہ اس ٹریکٹر کی خریداری میں کچھ منافع لے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ بازار میں موجود دس لاکھ روپے کا ٹریکٹر زید کو ادھار پر بارہ لاکھ میں دے گا اور زید کے ذمہ بارہ لاکھ کی ادائیگی قسطوں کی صورت میں ہوگی۔ زید کی طرف سے آمادگی کے بعد بنک نے ٹریکٹر کی فراہمی کی ایک درخواست زید سے لے لی جس میں یہ لکھا تھا کہ زید کو ایک عدد ٹریکٹر ان اوصاف کا درکار ہے۔ اس طلب نامہ پر دستخطوں کے بعد زید کو ٹریکٹر کی خریداری کے لئے رقم مہیا کردی۔ اور زید نے ٹریکٹر خرید لیا۔ پھر بنک نے ایک معاہدہ بیع پر زید سے دستخط کروائے جس میں ٹریکٹر کی قیمت خرید، اضافی اخراجات (رجسٹریشن فیس بنک کے چارجز وغیرہ شامل تھے) اور قیمت فروخت اور مدت ادائیگی وغیرہ کی تفصیلات تھیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کا معاملہ کیا شرعاً جائز ہے؟ اور بنک جس نے زید کو دس لاکھ کی گاڑی خرید کردی مگر وہ وصول بارہ لاکھ روپے کرے گا تو کیا یہ سود نہیں ہوگا؟ جبکہ بنک اسلامی بنکاری کا دعویدار ہے۔ (غلام رسول چشتی فیصل آباد)

جواب: صورت مسئولہ میں بنک کے اسلامی بنکاری کا دعویدار ہونے کی بنا پر اس مسئلہ کو شرعی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے جن امور کا جائزہ لینا ضروری ہے ان میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

۱۔ بنک کا اولاً قرض فراہم کرنے کی بجائے ٹریکٹر خرید کردینے کی بات کرنا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنک سودی قرضہ جاری کرنے سے اجتناب برتنا چاہتا ہے اور مال کی فراہمی کر کے گویا ایک تجارتی معاملہ کرنے کا خواہش مند ہے۔ یہ اسلامی اصول تجارت **واحل اللہ البیع وحرم الربوا** کے عین مطابق ہے۔ اور بظاہر بیع مرابحہ کا معاملہ لگتا ہے۔

۲۔ بنک کا زید کو ٹریکٹر پسند کرنے اور قیمتیں معلوم کرنے کے لئے بھیجنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے زید کو اپنا وکیل نامزد کیا کیونکہ ٹریکٹر کا ضرورت مند اگرچہ زید ہے لیکن بنک اس وقت خریدار ہے اور خریداری کے لئے بنک کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی افسر یا ملازم کے ذریعہ ٹریکٹر کی معلومات کرتا اور ٹریکٹر کی خریداری اپنے کسی ملازم کے ذریعہ کرتا، لیکن اس مشقت سے بچنے کے لئے بنک نے زید ہی کو یہ کام سونپ دیا بہتر ہوتا کہ یہاں بنک اور زید کے مابین ایک تحریری دستاویز بن جاتی کہ بنک نے زید کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے اور وہ بنک کے لئے ایک عدد ٹریکٹر جس کے مواصفات اس اس طرح ہیں خریدنے کا پابند ہے اور اس کام کی زید کو کوئی اجرت بھی بنک (اجرت وکالت) ادا کرسکتا تھا۔ پھر بنک کے وکیل کے طور پر زید ٹریکٹر کی تفصیلات حاصل کرتا اور خریداری کا معاملہ کرتا۔ تاہم اگر

بنک کے مجاز افسر نے زید کو زبانی طور پر بھی اپنا نمائندہ یا وکیل نامزد کر دیا اور زید نے ٹریکٹر کی خریداری بنک کے لئے کر لی تو جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

واذا اری الرجل الرجل السلعة فقال اشتر هذه واربحک فیها کذا ، فاشتراها الرجل فالشراء جائز، والذی قال اربحک فیها بالخیار ان شاء احدث فیها بیعا وان شاء ترکه (کتاب الام ۳/۳۳)

یہاں یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ خریدار بنک کا وکیل کیسے ہو گیا کیونکہ ابھی زید نے بنک سے خریداری کا کوئی معاہدہ نہیں کیا لہذا وہ خریدار نہیں نیز یہ کہ اسلامی بنکاری میں اب یہ معاملہ ایک عرف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ جسے سامان چاہئے ہوتا ہے اسی کے ذریعہ بنک خریداری کرالیتا ہے تاکہ اس کی حسب منشا وخواہش اسے سامان مل سکے اور عرف کا اعتبار شرع میں کیا جاتا ہے حتی کہ فرمایا: واعلم ان اعتبار العادة و العرف یرجع الیه فی الفقه فی مسائل کثیره حتی جعلوا ذلک اصلا (اشباه ص ۳۷)

۳۔ چونکہ مال کی خریداری کے بعد اس کا مشتری کی ملک میں آنا اور مبیع پر مشتری کا قبضہ ہونا شرط ہے اس کے بغیر وہ اسے کسی دوسرے کو فروخت نہیں کر سکتا اس لئے ٹریکٹر کی خریداری کے بعد بنک کا اس پر قابض ہونا شرط ہے۔ اور ٹریکٹر بنک کی ملکیت میں آنا ضروری ہے۔ جیسا کہ کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ وبیع المنقول قبل القبض لا یجوز بلاخلاف بین اصحابنا (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۳۰۶) اس مسئلہ میں چونکہ زید نے بنک کے وکیل کے طور پر ٹریکٹر خریدا اور اپنی ملکیت میں بحیثیت وکیل لے لیا اور ابھی زید اور بنک کے مابین مشتری اور بائع کی حیثیت نہیں اور نہ کوئی معاہدہ بیع طے پایا ہے تو بنک کا قبضہ ثابت ہو گیا کہ ابھی زید بنک کا وکیل ہے۔

اس کے بعد اگر بنک نے یہ ٹریکٹر ایک معاہدہ بیع کے ساتھ زید کو فروخت کر دیا اور اس میں صاف صاف لکھا کہ بنک کو یہ ٹریکٹر اتنے میں پڑا ہے، اس میں ٹریکٹر کی اصل قیمت جس پر خرید اور اس پر جو دیگر اخراجات ہوئے وہ شامل کر کے کل قیمت فرض کیجئے دس لاکھ پچاس ہزار ہوئی تو معاہدہ میں یہ بات آنی چاہئے تھی کہ بنک کو یہ ٹریکٹر دس لاکھ پچاس ہزار میں پڑا ہے اور زید کو بارہ لاکھ میں فروخت کیا جاتا ہے۔ جو آسان قسطوں کی صورت میں زید کو ادا کرنے ہیں۔

اگر یہ معاملہ اسی طرح ہوا ہے تو یہ معاملہ بیع مرابحہ کا ہے۔ کہ مرابحہ کی تعریف میں یہ ہے کہ: المرابحۃ مصدر رابح وشرعا بیع ما ملکہ بما قام علیہ وبفضل مؤنۃ (در مختار علی ہامش الرد ۴؍۱۷۱ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اگر بنک نے اسی طرح کیا ہے تو اس معاہدہ بیع میں کوئی شرعی قباحت نہیں کہ مرابحہ میں قیمت خرید پر یا جتنے میں چیز پڑی ہو اس کی وضاحت کے ساتھ اس پر نفع مقرر کر کے ادھار پر اسے فروخت کرنا جائز ہے اور یہ سود نہیں۔ کہ سود کی تعریف تو یہ ہے کہ رقم پر نفع حاصل کیا جائے اور بیع یہ ہے کہ مال کو نفع پر بیچا جائے۔ اور مال کا نقد یا ادھار نفع کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

ویصح البیع بثمن حال وموجل باجل معلوم (مجمع الانہر ج ۲ ص۸)

خلاصہ یہ کہ زید کا بنک سے مذکورہ بالا طریق پر ٹریکٹر خریدنا جائز ہے۔ اور اس میں زید کو جو دس ساڑھے دس لاکھ کی بجائے بارہ لاکھ روپے ادا کرنے ہیں تو وہ ٹریکٹر کی ادھار قیمت ہے جو اس نے معاہدہ بیع میں دینا تسلیم کی ہے۔ اگر بنک زید کو رقم فراہم کرتا اور یہ کہتا کہ یہ رقم ہے تم اس سے ٹریکٹر خریدو یا ٹرک، ہمیں تو دس کے بارہ لاکھ واپس چاہئیں تو یہ سود کا معاملہ ہوتا لیکن بنک نے رقم قرض پر نہیں دی بلکہ ٹریکٹر خرید کر دیا ہے اور یہ ٹریکٹر کی ادھار قیمت ہے۔ اور نقد یا ادھار کوئی شئی منافع پر فروخت کرنا جائز ہے۔ کما سبق۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مکانوں کی تعمیر، مرمت یا خریداری بصورتِ مشارکہ

س ۵: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میں عمر دین نے ایک مکان تعمیر کرنے کے لئے اسلامی بنک سے قرض مانگا۔ تو بنک والوں نے کہا کہ قرض کی بجائے آپ بنک سے مکان لے لیں اور اس کی دو صورتیں بیان کیں۔

۱۔ مکان خریدنے یا بنانے کے لئے آپ بیس فی صد رقم لگائیں اور ۸۰ فی صد رقم بنک لگائے گا اس طرح آپ بنک سے مشارکہ کرلیں۔

۲۔ یا اگر آپ کے پاس مکان کی قیمت کے بیس فی صد کے برابر رقم نہیں تو پھر بنک سے اجارہ کریں۔

مشارکہ کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ رقم ہے تو آپ بنک کو مکان کی تعمیر یا خریداری میں اپنا شریک بنالیں۔ اور اس طرح کہ مکان کی کل قیمت کا بیس فیصد حصہ آپ ادا کریں باقی ۸۰ فی صد بنک ادا کرے گا اور پھر آپ ہر ماہ یا تھوڑے عرصہ بعد کچھ رقم بنک کو ادا کرتے رہیں اس طرح جتنی رقم آپ بنک کو ادا کریں گے اتنا حصہ بنک کا کم ہوتا جائیگا اور آپ کا بڑھتا جائیگا تا آنکہ آپ مکان کے مالک بن جائیں گے۔

دوسری صورت یہ کہ آپ اجارہ کا معاملہ کرلیں اور اجارہ یہ ہے کہ آپ مکان بنک سے خریدوالیں، اب بنک مالک ہوگا اور آپ اس میں کرایہ دار کے طور پر رہیں۔ جو رقم آپ کرایہ کی مد میں ادا کریں گے وہ بنک میں جمع ہوتی رہے گی اور جب اتنی ہو جائے گی جتنی مکان کی قیمت خرید تھی تو اس وقت بنک آپ کو وہ مکان ہبہ کردے گا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا مذکورہ بالا دونوں یا کوئی ایک طریقہ اسلامی ہے؟ اس میں کوئی غیر شرعی معاملہ یا سود کا دھوکہ تو شامل نہیں۔ (عمر دین سکنہ ملتان دولت گیٹ)

جواب: الحمدللہ اب اسلامی بنکاری کی بنا پر سود سے اجتناب کے مواقع اہل پاکستان کو بھی میسر آرہے ہیں۔ اگر اسلامی بنکاری کا آپشن نہ ہوتا تو بنک مارک اپ پر قرضہ فراہم کرتے اور جسے سودی قرضہ نہیں چاہئے وہ اس سہولت سے محروم رہتا جو اسلامی بنکاری نے فراہم کی ہے۔

مذکورہ بالا سوال میں بنک کا یہ کہنا کہ قرض نہیں مکان لے لو یہی بہت خوش آئند بات ہے کہ نقد کا کاروبار ختم اور مال(commodity) کا کاروبار فروغ پارہا ہے۔ اور یہی اسلام کا منشاء ہے کہ روپے سے روپیہ نہ کماؤ بلکہ مال سے روپیہ کماؤ۔ تجارت کو فروغ دو اور پیسے سے پیسہ کمانے کے رجحان کو ختم کرو۔

مذکورہ بالا دونوں صورتیں اسلامی بنکاری نے پیش کی ہیں اور دونوں ہی اگر اپنی اصلی کیفیت کے ساتھ نافذ کی جائیں تو بڑی عمدہ ہیں۔

۱۔ مکان کے لئے بنک سے مشارکہ کرنا:

مشارکہ یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ شریک کسی مال یا عقار (پراپرٹی) میں حصہ دار بن جائیں اور وہ مال یا جگہ ان دونوں کی مشترکہ قرار پا جائے۔ اصطلاح فقہاء میں شرکت سے مراد:

ھی عبارۃ عن اختلاط نصیبین فصاعدا بحیث لا یعرف احد النصیبین من الآخر (فتح القدیر ج ۵ ص ۳۷۶ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) نیز الشرکۃ فی المعروف لغۃ الخلطۃ سمی بھا العقد لانھا مسببۃ (فتح القدیر ج ۵ ص ۳۷۶)

مذکورہ سوال میں یہ بتایا گیا ہے کہ بنک نے سائل کو مشارکہ کی دعوت دی کہ وہ مکان کی خریداری میں بنک کو شریک کرلے گویا کچھ رقم وہ مہیا کرے اور بقیہ رقم بنک مہیا

کرے گا اور عموماً اس طرح کے مشارکہ میں بنک کا حصہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے مشارکہ کو تمویل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں بھی سائل نے بنک سے تعمیر مکان کے لئے قرض مانگا تو بنک نے کہا کہ قرض کی بجائے مکان لے لو اور اس نے سائل کو دعوت دی کہ وہ اس میں کچھ رقم اپنی ملا کر مشارکہ کرلے یا اجارہ کرلے۔

مشارکہ اور اجارہ دونوں شریعت اسلامیہ میں جائز ہیں بشرطیکہ ان شرائط کا التزام کیا جائے جو مشارکہ اور اجارہ کے لئے طے ہیں۔ مشارکہ کی یہ صورت جو مکان کی خریداری کے معاملہ میں ہے شرکت الملک سے تعلق رکھتی ہے۔ شرکت الملک کی تعریف یہ ہے کہ:

ان یکون الشئی مشترکا بین اثنین او اکثر بسبب من اسباب التملک کالشراء والھبۃ والوصیۃ والارث او خلط الاموال او اختلاطھا بصورۃ لا تقبل التمییز والتفریق۔ (الوجیز للامام الغزالی ۱/۱۴۶)

(یعنی کوئی چیز ان اسباب ملکیت (تملک) میں سے کسی سبب سے دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے مابین مشترک ہو، جیسے خریداری کے سبب، ہبہ، وصیت، میراث، یا اموال کے اختلاط کے سبب اور اختلاط ایسا کہ ان میں امتیاز و فرق نہ کیا جاسکے۔)

شرکت ملک پھر دو قسم کی ہے ایک شرکت بالاختیار اور دوسری شرکت بالجبر۔ یہاں اس مسئلہ میں یہ شرکت اختیاری ہے، اور شرکت اختیاری کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں کہ **ان یجتمع الشریکان او اکثر فی ملک الشئی بالاختیار (الشامی ۴/۳۰۰)**

صورت مسئولہ میں مشارکہ کرنے کی صورت میں مکان کا طلب گار ۲۰ فی صد رقم کا مشارکہ کرے گا اور بنک ۸۰ فی صد کا اور مشارکہ کا معاہدہ ہوجانے کے بعد اب مکان خرید لیا جائے گا اور اس مکان کے کاغذات مشترکہ ملکیت کے کاغذات ہوں

گے۔ شریک اول (عمر دین) اس مکان کے بیس فی صد حصہ کا گویا مالک ہوگا اور بنک ۸۰ فی صد کا۔ اب عمر دین کو یہ مکان کرایہ پر حاصل کرنے کا ایک معاہدہ بنک سے کرنا ہوگا کہ وہ اس مکان میں رہنا چاہتا ہے تو چونکہ شریعت اسلامیہ کی رو سے کسی شریک کا اپنی ملک میں ... مقررہ استعمال کرنے کا باجازت شریک یا شرکاء اختیار ہے۔ جیسا کہ شامی میں ہے کہ **لو تهايا: (الهيئة به والمهاياة) وهي في لسان الشرع قسمة المنافع وانها جائزة في الاعيان المشتركة التي يملك الانتفاع بها على بقاء عينها وان التهايو قد يكون في الزمان وقد يكون من حيث المكان.**

اس طرح شریک اول ملک مشترک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مکان میں رہے گا اور شریک ثانی یعنی بنک اگر مطالبہ کرے تو اس کو اس کے حصہ کا کرایہ ادا کرے گا۔ نیز وہ ایک مدت مقررہ جو فریقین میں طے پا جائے، کے اندر شریک ثانی (بنک) کے حصہ کو خریدنے کے لئے قسطوں میں رقم ادا کرتا رہے گا۔ اس پراپرٹی کی کل لاگت کا وہ حصہ جس کا مالک بنک ہے اس کے یونٹ بنا لئے جائیں گے۔ مثلاً کل پراپرٹی اگر ایک لاکھ کی ہے اور اس میں بیس فیصد حصہ شریک اول کا ہے تو اس کے بیس یونٹ ہوئے جو اس کی ملکیت ہیں اور ۸۰ یونٹ بنک کے ہوئے جو اسی فیصد کا مالک ہے ہر یونٹ کی قیمت ایک ہزار ہو تو ۸۰ یونٹ ۸۰ ہزار کے ہوئے۔ شریک ثانی ہر ماہ یا وقفہ وقفہ سے شریک اول کے یونٹ خریدتا رہے گا اور جب ۸۰ یونٹ کی قیمت ادا کر چکا ہوگا تو معاہدہ کے مطابق شریک ثانی شریک اول کے پورے حصص کا مالک ہو چکا ہوگا اور یوں یہ پراپرٹی شریک اول کے نام منتقل ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ مکان میں رہائش کے دوران شریک ثانی جو کرایہ ادا کرے گا ملکیتی حصوں کی خریداری کے حساب سے کرایہ بھی باہمی مشاورت سے تبدیل ہوتا رہے گا کیونکہ جس قدر شریک ثانی کی ملکیت بڑھتی جائے گی وہ مستاجر کم اور مالک زیادہ بنتا جائے گا اور اس طرح کرایہ میں بتدریج

کمی ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ اسلامی بینک کے ساتھ مشارکہ کا یہ معاملہ جائز ہوگا۔ اسے مشارکہ متناقصہ کہ سکتے ہیں مشارکہ متناقصہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ:

قد یشترک المصرف مع احد العملاء فی ملکیة عقار مثلا, مع الاتفاق بینهما علی ان یسدد العمیل الی المصرف عددا محددا من الاقساط الدوریة, یتنازل بانتهائها المصرف عن حصته فی الملکیة للعمیل الذی یصبح فی النهایة مالکا للعقار کله (الفتاوی الشرعیة فی الاقتصاد. جدة ط ۳ ص ۵۹)

مکان حاصل کرنے کے لئے بنک کی تجویز کردہ دوسری صورت اجارہ کی ہے۔

اجارہ کے معنی ہیں کوئی چیز کرایہ پر لینا۔ جو شخص کوئی چیز کرایہ پر دے اسے اصطلاح میں موجر (Lessor) کہتے ہیں اور جو کرایہ پر کوئی چیز حاصل کرے اسے مستاجر (Lessee) کہا جاتا ہے۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز مستاجر(Leased) کہلاتی ہے اور اس عمل کو اجارہ یا لیزنگ(Leasing) کا نام دیا گیا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اجارہ کا معاملہ بیع کی طرح کا ہے کہ جس طرح بیع میں اہلیت، ایجاب وقبول مجلس عقد، شرا ئط صحت اور تنفیذ کے معاملات ہیں ویسے ہی اجارہ میں بھی ہے۔ تاہم بعض باتیں بیع اور اجارہ کی مختلف ہیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اجارہ میں عقد کسی شئی پر نہیں بلکہ اس شئی سے نفع اٹھانے (منفعت) پر ہوتا ہے۔

اسلامی بنک نے جو اجارہ کا مشورہ دیا ہے وہ درست ہے جب کہ اجارہ شرعی طریقہ کے مطابق ہو اور اس میں کوئی غیر شرعی شروط نہ ہوں۔

صورت مسئولہ میں اجارہ کی صورت یہ بنے گی کہ بنک (فریق اول) عمر دین (فریق ثانی) کو ایک مکان خرید کر دے گا جو عمر دین کی ضرورت اور خواہش کے مطابق ہوگا۔ اور اس مکان کا مالک فریق اول (بنک) ہوگا۔ مکان کی قیمت خرید اور خریداری

کے اخراجات سمیت اس کی جو بھی لاگت آئے گی بنک ادا کرے گا اور مکان بنک کی ملکیت ہوگا۔

فریق ثانی اس مکان کو بنک سے کرایہ پر حاصل کرے گا اور اسے مالکانہ حقوق حاصل نہ ہوں گے۔ مکان کا جو کرایہ بنک مقرر کرے گا فریق ثانی وہ کرایہ ادا کرتا رہیگا۔

عموماً بنک یہ کرتے ہیں کہ اجارہ کرتے وقت مستاجر سے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ جب مکان کے کرایہ کی مد میں اتنی رقم بنک کو وصول ہو جائے گی جو اس کی قیمت کے مساوی ہے تو یہ مکان کرایہ دار کی ملکیت میں چلا جائے گا۔ اجارہ میں ایسا کوئی پیشگی معاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر وعدہ ہو کہ ایسی صورت میں مکان اسی کرایہ دار کو دیا جائے گا جو شروع سے مستاجر ہے تو کوئی حرج نہیں مگر اجارہ میں اس طرح کا کوئی معاہدہ (عقد) کرنا عقد ہبہ یا عقد بیع کا معاملہ ہوگا اور یہ صفقة فی صفقة کے زمرے میں آئے گا جو کہ ناجائز ہے۔ لہٰذا صرف زبانی وعدہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ وعدہ عقد اجارہ کو مستلزم نہیں ہوگا کیونکہ اگر اس شرط پر اجارہ کیا کہ وہ شئی جس کی منفعت کا اجارہ ہوا ہے وہ مستاجر کی ملک ہو جائے گی تو یہ شرط عقد اجارہ ہی کو باطل کردے گی۔

ہاں البتہ اگر وعدہ کیا مگر عقد اجارہ سے قبل کیا تو عقد اجارہ کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ بنک کو اختیار ہے کہ وہ اجارہ کی مد میں وصول ہونے والی رقم مکان کی قیمت کے برابر وصول ہو جانے پر یا مدت اجارہ مکمل ہونے پر اس مکان کو فروخت کردے اور یہی مستاجر خرید لے یا وہ مستاجر کو مکان ہبہ کردے یا کسی اور کو فروخت کردے۔

چنانچہ صورت مسئولہ میں اسلامی بنک سے اجارہ شرعیہ کرنا درست ہے اور سودی قرض لے کر مکان تعمیر کرنے سے یہ معاملہ درجہا بہتر ہے۔ کہ وہ حرام خالص اور یہ مشروع وحلال۔ واللہ اعلم بالصواب۔

....

مشارکہ، استصناع یا مضاربہ کی ایک صورت

سوال ۶: زید کا چمڑے کی جیکٹس بنانے کا کارخانہ ہے زید نے بیرون ملک ایک کمپنی سے کاروباری تعلق قائم کیا اس کمپنی نے اسے آرڈر دیا کہ دس ہزار جیکٹس تیار کر کے بھجوائے۔ دس ہزار جیکٹس تیار کرنے کے لئے زید کو جو میٹریل درکار ہے اور اس کے علاوہ جو اخراجات آئیں گے ان کے لئے سرمایہ نہیں اور وہ سود پر قرض لے کر یہ کام کرنا نہیں چاہتا چنانچہ اس نے ایک اسلامی بنک سے قرض حسنہ طلب کیا تا کہ وہ یہ کام کر سکے مگر بنک نے اسے مشورہ دیا کہ قرض حسنہ کی بجائے وہ بنک کو اس کاروبار میں شریک کرے تو بنک اور زید دونوں کو نفع ہو سکتا ہے۔ اور اس میں نہ تو زید مقروض ہوگا اور نہ کوئی اس کے ذمہ سود ہوگا۔ اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے کہ زید قرض سے بھی بچ جائے اور کاروبار میں بنک کو شریک کر کے کاروبار وسیع کر سکے۔

جواب: الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین اما بعد۔ زید کو جس اسلامی بنک نے یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قرض نہ لے اور کاروبار میں شراکت قبول کر لے وہ بنک اسلامی اصولِ تجارت کو گویا عوام میں مقبول بنانے میں کوشاں ہے۔ اور خود بھی جائز کاروبار میں سرمایہ کاری کر کے سود کی بجائے تجارت کے فروغ میں دلچسپی رکھتا ہے اور یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

صورت مسئولہ میں بنک کو زید کے کاروبار میں شراکت کے لئے مشارکہ استصناع یا مضاربہ کی صورت اختیار کرنا ہوگی۔

استصناع کی تعریف یہ ہے کہ: کوئی چیز بنانے کی طلب یا ڈیمانڈ کرنا یا اس کا آرڈر دینا۔ آسان لفظوں میں آرڈر پر مال تیار کروانا استصناع ہے اور اس میں مال تیار کرانے والا میٹریل مہیا کرتا ہے یا میٹریل کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اور جس کارخانہ دار یا کمپنی سے مال تیار کرایا جاتا ہے اسے مال تیار کرنے کی اجرت دی جاتی ہے جس میں اس کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے اور اس معاہدہ میں مال کی کوالٹی اور دیگر مواصفات بیان کی جاتی ہیں۔

صورت مسئولہ میں بنک زید کو اتنا سرمایہ فراہم کرے گا کہ جس سے مطلوبہ مال بآسانی تیار ہو سکے اور وہ زید کے ساتھ مضاربت کر سکتا ہے کہ سرمایہ بنک کا اور محنت زید کی۔

مضاربت کی صورت میں زید مضارب اور بنک رب المال ہوگا اور مال تیار ہونے پر یہ مال زید مذکورہ پارٹی کو سپلائی کرے گا اور حاصل شدہ منافع میں بنک اور زید طے شدہ تناسب سے شریک ہوں گے۔

یا بنک زید سے استصناع کر سکتا ہے کہ مال تیار کرا کر اور مال پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مال زید ہی کو منافع پر فروخت کر دے اور پھر زید یہ مال اس پارٹی کو فروخت کرے جس نے مال کا آرڈر دیا تھا۔

یہ طریقہ کار شریعت کے اصول تجارت کے مطابق ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ اس سے بنک اور زید دونوں سودی قرض کے لین دین اور سودی کاروبار سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور حلال تجارت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

....

مرابحہ اور سودی قرض میں فرق

سوال ۷ : اسلامی بنکوں میں جاری بیع مرابحہ اور سودی قرض کے معاملہ میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب : بیع مرابحہ اور سودی قرض میں بہت بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ بیع مرابحہ بیع ہے اور سودی قرض ربوی معاملہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے واحل اللّٰہ البیع وحرم الربوا ....

بیع مرابحہ میں یہ ہوتا ہے کہ بینک کسی شخص کے ساتھ سامان کی (بیع) خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ بینک کسی شخص یا کمپنی یا ادارے سے کوئی سامان خریدتا ہے۔ اور اسے اپنی ملکیت میں لینے کے بعد فروخت کے لئے پیش کرتا ہے۔ اگر وہی ادارہ یا شخص یا کمپنی اس سے وہ سامان لینا چاہے تو اس کے ساتھ فروخت کا نیا معاملہ ہوتا ہے اور بینک اپنے نرخوں پر اسے یہ سامان فروخت کر دیتا ہے اور طے شدہ منافع سے زائد بینک بطور منافع کچھ نہیں لے سکتا۔ یہ سامان کی بیع ہے اور بیع کتاب وسنت میں مشروع ہے۔

جبکہ قرض کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ بینک سے ایک مدت مقررہ پر کاروبار کے لئے نقد روپیہ ادھار پر لیتا ہے اور بینک اسے یہ بتا دیتا ہے کہ اس روپیہ پر اتنی مدت کے لئے اتنے فی صد سود اسے ادا کرنا ہوگا۔ یہاں کوئی سامان یا مال موجود نہیں بلکہ براہ راست پیسے پر پیسہ وصول کرتا ہے اور یہی وہ عین سود اور حرام ہے۔ جسے زمانہ جاہلیت سے ربا النسیئہ کہا جاتا ہے۔

شریعت مطہرہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ سرمایہ پر سرمایہ نہ وصول کریں اور نقد کو جنس تجارت نہ بنائیں بلکہ اجناس تجارت کا کاروبار کریں اور نقد کو ذریعہ تبادل رہنے دیں۔

اسلامی بینکوں اور غیر اسلامی بینکوں کے مابین لین دین

سوال ۸: اسلامی بینک غیر اسلامی بنکوں کے ساتھ خاص طور پر بیرونی کمرشل بنکوں کے ساتھ کس طرح معاملات کریں گے؟

جواب :: غیر اسلامی بنکوں کے ساتھ اسلامی بنکوں کو معاملات کا اب خاصا تجربہ ہو چکا ہے۔ خاص طور پر امپورٹ ایکسپورٹ کے حوالے سے۔ اسلامی بنکوں کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ دوسرے بنکوں کے ساتھ لین دین کے باہمی معاملات میں یہ معاہدہ کریں کہ نہ وہ اپنے فراہم کردہ سرمایہ یا گارنٹیز پر کوئی سود لیں گے اور نہ ہی انہیں ادا کریں گے۔ اور یہ تعامل بالمثل کی ایک صورت ہوگی۔ اور اس طرح کا تعامل اسلام میں جائز ہے اور اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ مسلم وغیر مسلم کا آپس میں لین دین اگر بلا سود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ صدر اسلام میں ہوتا رہا ہے۔ مسلمان غیر مسلم اقوام سے اسی اصول پر تجارت کرتے رہے ہیں۔ سود چیزی میں دے دیں۔

....

اسلامی بینکاری اور بڑے منصوبے

سوال ۹ : کیا اسلامی بنکاری ملک کے بڑے بڑے منصوبوں میں سرمایہ کاری کرنے کے قابل ہے یا صرف کار لیزنگ کی حد تک ہی محدود ہے۔؟

جواب : اسلامی بنکاری ملک کے بڑے سے بڑے منصوبوں میں سرمایہ کاری کرنے کے قابل ہے بشرطیکہ جو اسلامی بنک سرمایہ کاری کر رہا ہے اس کے پاس اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو۔ایک سے زائد بنک مل کر بھی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ اسے ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں مثلاً۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی کسی بھی بڑے شہر میں ایک نیا ائرپورٹ تعمیر کرنا چاہتی ہے جس کی لاگت فرض کیجئے کئی بلین روپے ہے تو اسلامی بنک اور سول ایوی ایشن اتھارٹی کے مابین استصناع کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ اس میں اتھارٹی بنک سے ائیرپورٹ تعمیر کر کے دینے کا مطالبہ کرے گی اور بنک اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے اتھارٹی کے ساتھ استصناع کا معاہدہ کرے گا۔ اس معاہدہ میں ائیرپورٹ کی مالیت طے ہو جائے گی کہ مکمل ائرپورٹ تمام ضروری لوازمات کے ساتھ جو آرکیٹکٹس کے مہیا کردہ نقشے کے مطابق ہوں گی، کتنے سرمایہ میں بنک تعمیر کروا کر دے گا۔ پھر بنک اپنے طور پر کسی ایسی بڑی فرم کو ائیرپورٹ بنانے کا ٹھیکہ دے گا جس کے کام سے سول ایوی ایشن اتھارٹی مطمئن ہو۔ اور اس فرم کو بنک سرمایہ فراہم کرتا رہے گا۔ ائرپورٹ کی تعمیر مکمل ہونے پر بنک ائرپورٹ کو اتھارٹی کے حوالے کر دے گا اور اس سے معاہدہ میں طے شدہ شیڈول کے مطابق طے شدہ رقم وصول کرے گا۔

اس سے بھی بڑا پروجیکٹ کسی بڑی شاہراہ (موٹروے) کی تعمیر کا ہوسکتا ہے جس کی مالیت کروڑوں اربوں روپے ہو اس میں بنک نہ صرف استصناع کرسکتا ہے بلکہ مشارکہ بھی کرسکتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حکومت یا موٹروے اتھارٹی کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر شاہراہ تعمیر کی جائے اور اس شاہراہ کی تعمیر پر خرچ آنے والا سرمایہ حکومت اور بنک مل کر لگائیں اور اس سے حاصل ہونے والی آمدن (موٹروے ٹیکس وغیرہ) میں حکومت اور بنک شریک ہو جائیں۔ پھر اس میں مشارکہ متناقصہ کی بنیاد پر بنک اپنا حصہ حکومت کو بتدریج فروخت کرتا رہے اور حکومت بالآخر موٹروے کی مالک بن جائے۔

....

انشورنس کی شرعی حیثیت

سوال ۱۰: کیا اسلام میں انشورنس کرانا حرام ہے؟

آج کل جب کہ حکومتیں لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں اور متعدد اسلامی ملکوں میں لوٹ مار، چوری ڈکیتی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہے نہ مال و جان، ایسے میں انشورنس کرانا ناجائز ہی رہے گا؟ انشورنس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے آخر کیوں؟ اور اس کی کوئی جائز صورت بھی ہے یا نہیں؟

جواب: الحمد للہ رب العالمین وبہ نستعین

آپ کے سوال کا جواب قدرے تفصیل سے پیش خدمت ہے۔ سوال کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کیا رائج الوقت نظام انشورنس ناجائز ہے؟

۲۔ معروضی حالات میں انشورنس کے جواز کی صورت؟

۳۔ رائج الوقت انشورنس کے حرام ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟

۴۔ انشورنس کی کوئی جائز صورت؟

ان تمام سوالوں کا جواب دینے سے قبل انشورنس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنا اس کے مقاصد و مفاسد جاننا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اسلام انسانوں کی جان و مال کی حفاظت کا حکم دیتا ہے اور اس سلسلہ میں فرد و جماعت کی ذمہ داریوں کا

تعین کرتا ہے۔وہ کسی بھی مرحلہ زندگی میں انسان کو بے آسرا نہیں چھوڑتا اور نہ اندھیرے میں رکھتا ہے۔انشورنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انسانوں کی فلاح کا ایک پروگرام اور اسکیم ہے۔اس کے واضعین نے اس کے جو مقاصد بیان کئے ہیں ان میں اہم مقصد مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے قبل از ورود مصیبت اس کا انتظام کرنا ہے۔چنانچہ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ اور کارندے جو مختلف لوگوں کو بیمہ کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ لوگوں کی تکالیف کے ازالہ، حادثات کی صورت میں پیش آمدہ مالی مشکلات کا حل اور باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی مدد بیمہ کا اصل مقصد ہے۔

انشورنس کے بارے میں انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا کے الفاظ یہ ہیں۔

Insurance is a device to handle risk its primary function is to substitute certainty for uncertainty as regards the economic cost of disasterous events. Insurance may be defined more properly as a system under which the insurer for a consideration , promises to reimburse the insured or to render services to the insured in the event that certain accidental occurrences result in losses during a given time period. (The New Encyclopaedia Britanica 15th edition vol 9 p.45)

انشورنس کی اس تعریف میں اس کا بنیادی مقصد نہایت واضح ہے۔مگر یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے جن مقاصد سے گزرنا ہوتا ہے وہ بیمہ کی اصل روح (تعاون) کے خلاف اور برعکس ہیں بلکہ ان میں کئی ایک عناصر اسلام کے نظام عدل سے متصادم ہیں۔جیسے سودی معاملات، قمار (جوا) اور غرر (دھوکہ) خاص طور پر نمایاں ہیں۔

فقہاء کرام کو اللہ تبارک وتعالیٰ اجر جزیل عطا فرمائے اور ان کے مراتب کو بلند فرمائے کہ انہوں نے ہماری رہنمائی کے لئے پہلے ہی ایسے رہنما اصول مرتب فرمادئے کہ رہتی دنیا تک جن سے ہدایت کی روشنی ایک جہاں کو منور کرتی رہے گی۔ فقہاء کرام نے اجتہاد (تحقیق وجستجو۔ ریسرچ) کا دروا کیا اور آئندہ پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی راہیں متعین کیں۔ اسلام کا ماضی گواہ ہے کہ جب بھی کبھی علماء اسلام کے سامنے نئے مسائل آئے وہ فوراً ان میں تحقیق وجستجو کرنے لگے اور انہوں نے اپنے متبعین کو ریسرچ کا عادی بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس تحقیق کا شہرہ پورے عالم اسلام میں تھا جہاں ہزارہا مسائل پر تحقیق کا کام ہو۔ آج بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید مسائل پر اسی انداز سے تحقیق کرنے کا کام ہو جس انداز سے ہمارے اسلاف نے کیا۔

انشورنس جدید مسائل میں سے ایک ہے۔ آپ نے جو یہ کہا کہ کیا انشورنس کرانا ناجائز ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ چونکہ انشورنس کمپنیاں متعین پریمیم والا تجارتی انشورنس، کرتی ہیں اور یہ ایک ایسا عقد ہے جو صراحتاً دھوکے پر مبنی ہے اور دھوکہ دہی اسلام میں حرام ہے۔ لہذا شرعاً انشورنس کمپنیوں کا یہ عقد، عقد فاسد ہے۔ علامہ عبدالحکیم شرف صاحب نے بیمہ کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: بیمہ کا معاہدہ بیع ہے بمستامن جو رقم قسط وار ادا کرتا ہے وہ معاوضہ ہے اس تحفظ کا جو موٴمن کی جانب سے ادا کیا جاتا ہے اور یہ تحفظ بیمہ کی رقم کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ مستامن بروقت صرف ایک قسط ادا کرتا ہے باقی اس کے ذمہ دین ہے اور بیمہ کی رقم موٴمن کے ذمہ دین ہے اس طرح یہ معاہدہ بیع الدین پر مشتمل ہے۔

اس معاہدے میں کئی وجہ سے غرر پایا جاتا ہے۔

۱۔ بیمۂ زندگی کے علاوہ تمام اقسام بیمہ میں معاہدہ کے وقت بیمہ کی رقم موجود اور

متعین نہیں ہوتی جب تک خطرہ واقع نہ ہو جائے اس کی تعین نہیں ہوتی یہ غرر فی الوجود التعین ہے۔

۲۔ بیمۂ زندگی کے علاوہ باقی قسموں میں مدت بیمہ گزر جانے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا تو بیمہ کی رقم سوخت ہو جاتی ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا یہ غرر فی الحصول ہوا۔

۳۔ زندگی کے بیمہ کے علاوہ اقسام میں اگرچہ رقم کی زیادہ سے زیادہ مقدار معین کر دی جاتی ہے لیکن نقصان ہونے پر نقصان کے تناسب سے معین کی جاتی ہے یہ غرر فی المقدار ہے جب کہ بیمہ کی قسط فوری طور پر ادا کر دی جاتی ہے۔

۴۔ بیمہ کی تمام قسطوں میں بیمہ کی قسط ادا کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے جب کہ بیمہ کی رقم ادا کرنے کا وقت متعین نہیں ہوتا، کیونکہ موت اور حادثہ کا وقت متعین طور پر ہمیں معلوم نہیں ہے، یہ غرر فی الاجل ہے۔

پھر یہ عقد، قمار بھی ہے جیسے کہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے فتاوی رضویہ (جلد ہفتم ص ۱۱۳) میں فرمایا ہے۔

اس میں ربا کا پہلو بھی موجود ہے کیونکہ مستامن نے جتنی رقم جمع کروائی ہے اس پر بیمہ کمپنی کے قواعد کے مطابق معین نفع بھی دیا جاتا ہے۔

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ کیا ہندوستان کے اہل حرب سے ربا لینا جائز ہے؟ خواہ وہ ہنود ہوں یا نصاریٰ۔

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

۱۔ بحمدہ تعالیٰ ہندوستان دار الاسلام ہے۔

۲۔ ربا کے بارے میں حق یہ ہے کہ مطلقاً ناجائز ہے، کیونکہ نصوص تحریم مطلق ہیں۔

۳۔ باقی ربا دار الحرب میں زائد مال کا لینا وہ ربا ہے ہی نہیں، کیونکہ ربا مال معصوم

میں ہوتا ہے اور دار الحرب والوں کا مال معصوم نہیں ہے۔

۴۔ یہ حکم ہر حربی غیر مستامن کو شامل ہے، اگر چہ دار السلام میں ہو، کیونکہ دارومدار معصوم نہ ہونے پر ہے اور عدم عصمت سب کو شامل ہے۔ ہم پر ان کے ساتھ صرف غدر (دھوکہ) ناجائز ہے، اس کے بغیر ان کا مال جس عنوان سے بھی لے لیا جائے جائز ہے، کیونکہ یہ مال مباح لیا گیا ہے (شرط یہ ہے کہ یہ نیت نہ ہو کہ میں سود لے رہا ہوں، ورنہ ناجائز ہوگا)۔

۵۔ اس کے باوجود بطور تنبیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حربی غیر مستامن سے زائد مال اعلانیہ لے گا اگر چہ وہ صحیح نیت کے ساتھ لے گا، لیکن عوام اس پر رباخوری کا الزام لگائیں گے، چونکہ تہمت کے مقامات سے بچنا چاہیے اس لیے دینی حیثیت رکھنے والے حضرات کو اس سے بچنا چاہیے۔ (ترجمہ عربی عبارت ملخصا)

(فتاویٰ رضویہ جلد ۷ ص ۱۱۵)

اس کے باوجود دوسری جگہ بیمہ سے متعلق سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:
یہ بالکل قمار ہے اور محض باطل کہ کسی عقد شرعی کے تحت داخل نہیں، ایسی جگہ عقود فاسدہ بغیر غدر کے جو اجازت دی گئی ہے وہ اس صورت سے مقید ہے کہ ہر طرح اپنا ہی نفع ہو اور یہ ایسی کمپنیوں میں کسی طرح متوقع نہیں، لہٰذا اجازت نہیں، کما حقق المحقق علی الاطلاق فی فتح القدیر۔ (فتاویٰ رضویہ جلد ۷، ص ۱۱۳)

عقد بیمہ کو ضمان خطر طریق یا ضمان ورک پر قیاس کرنے کا سوال تو اس وقت ہوگا جب بیمہ میں غرر فاحش، قمار اور ربا وغیرہ مفاسد نہ پائے جائیں، ان کے ہوتے ہوئے قیاس اور الحاق کا کیا فائدہ ہوگا؟

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے سوکرہ کی جو صورت بیان کی ہے اس میں تو انھوں نے ہلاک ہونے والے مال کا معاوضہ لینے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

والذی یظھر لی انہ لا یحل للتاجر اخذ بدل الھالک من مالہ لا ن منا التزام ما لا یلزم (ردالمختار جلد ص ۲۷۳)

ٹیکسوں سے بچنا ایسا امر نہیں ہے انسان حالت اضطرار کو پہنچ جائے اور اس کے لئے ناجائز امور کا ارتکاب جائز ہو جائے۔

قانونی اعتبار سے بیمہ کرانا لازمی ہو تو ضرر سے بچنے کیلئے بیمہ کرالیا جائے اور ساتھ ہی لکھ دیا جائے کہ میں یا میرا وارث اتنی ہی رقم لے گا جتنی کہ جمع کروائی ہوگی۔

(الف) جب یہ عقد ناجائز ہے تو اضافی رقم لینے والا گنہگار ہوگا ،اسے چاہیے کہ زائد رقم غرباء میں تقسیم کر دے۔

فسادات میں ناحق ضائع ہونے والے جان ومال کا معاوضہ قرار دیکر اضافی رقم کا وصول کرنا اور اپنے مصارف میں خرچ کرنا ایک ناجائز کام کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، نیز نقصان کسی کا ہو اور معاوضہ کوئی دوسرا وصول کرے یہ بھی خلاف معقول ہے۔

(ب) اس سوال کا جواب سوال نمبر ۲ کے جواب میں آچکا ہے۔

البتہ ایسی انشورنس جو تعاونی ہو اور جس میں دھوکہ فریب سود اور قمار نہ ہو اور شرعاً اور بھی کوئی چیز یا کوئی عقد اس کا فاسد نہ ہو تو ایسی انشورنس جائز ہوگی مثلاً یہ کہ انشورنس کا مقصد اگر عاقلہ کے نظام پر ایک انجمن امداد باہمی قائم کر کے نقصانات کی تلافی کی راہ نکالنا ہے تو ایسی انجمن کا ممبر بن کر تعاونی بیمہ یا انشورنس کرانے میں کوئی بات حرمت کی نہیں۔ البتہ انشورنس کمپنیاں جس طرز پر انشورنس کے نظام کو لے کر چل رہی ہیں چونکہ اس میں واضح طور پر سود، قمار، اور غرر جیسی قباحتیں موجود ہیں اس لئے آنکھ بند کر کے کسی بھی انشورنس کمپنی سے انشورنس کرالینا درست نہیں۔

معروضی حالات میں جب کسی کی جان ومال اور آبرو محفوظ نہیں نہ املاک کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام ہے، ایسے میں بعض علماء نے انشورنس کے موجودہ نظام ہی

سے مستفید ہونے کی اجازت دی ہے مگر شرط یہ لگائی ہے کہ متبادل میسر آنے تک مجبوراً اس نظام میں انشورنس کرانا لازمی ہو تو کرالی جائے۔

علماء کرام کا فرض ہے کہ قوم کو سودی نظام معیشت اور سودی وقماری نظام انشورنس کی صرف حرمت ہی نہ بتائیں بلکہ اس سے نکلنے کا مکمل نظام بھی وضع کریں اور اسلامی بنکاری کی صحیح شرعی اسکیم بنا کر دیں۔ نیز اسلامی انشورنس کا مکمل سیٹ اپ تیار کر کے دیں اور پھر اپنے اثر ورسوخ سے اسلامی انشورنس کمپنیاں پرائیویٹ طور پر قائم کروائیں۔ تاکہ قوم کو سودی نظام سے نجات مل سکے۔

سردست انشورنس کا متبادل تکافل ہے جسے اسلامی انشورنس کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ تکافل کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک کمپنی تکافل کے نام پر قائم کی جائے جیسا کہ ملائشیا' عرب امارات سوڈان اور کویت وغیرہ میں ہیں۔ اس کمپنی کا کام یہ ہو کہ یہ انشورنس کا متبادل فراہم کرے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ انجمن امداد باہمی کی طرز پر ایک انجمن ہو جو لوگوں سے تبرعات وصول کرے۔ ہر شخص جو اس انجمن کا ممبر بننا چاہتا ہو ایک مخصوص رقم جو انجمن مقرر کرے گی بطور تبرع ہر ماہ جمع کرائے گا۔ اور اس تبرع میں اس کی نیت یہ ہوگی کہ جو لوگ اس انجمن کے ممبر ہیں ان میں سے اگر کسی کو ضرر لاحق ہو تو عاقلہ کے قدیم نظام کے مطابق اس رقم سے اس کی مدد کی جائے۔ انجمن یہ طے کر سکتی ہے کہ مثلاً کسی ممبر کے انتقال کی صورت میں اس کے لواحقین کو دس لاکھ روپے۔ کسی ممبر کی گاڑی چوری ہونے یا مکمل تباہ ہونے کی صورت میں گاڑی کی مالیت کے لحاظ سے مثلاً پانچ دس پندرہ لاکھ روپے۔ (جو بھی طے شدہ ہو) گھر میں آگ لگنے یا دکان وغیرہ کے کسی آسمانی یا زمینی آفت کی صورت میں نقصان کے اندازے کے لحاظ سے ایک مخصوص رقم۔ علیٰ ہذا القیاس۔

ممبرز کی جمع شدہ رقم چونکہ تبرعات کی رقم ہے ممبرز کا اس پر اب کوئی حق ملکیت

کا نہیں تاہم وہ اس کے امین ہوں گے بایں صورت کہ یہ سب کی جمع کردہ رقم ہے اور سب اس کے امین ہیں۔ان ممبرز میں سے تکافل کمپنی ایک انتظامیہ کمیٹی بنا سکتی ہے جو اس سارے سرمایہ کا حساب رکھے اور اس سرمایہ کو کاروبار میں لگائے۔ کمیٹی ملازمین رکھ سکتی ہے اور یوں حاصل شدہ سرمایہ مضاربت یا مشارکت پر کسی جائز کاروبار میں لگایا جاسکتا ہے۔اس کاروبار سے حاصل شدہ نفع بھی اسی انجمن کے کھاتے میں جمع ہوتا رہے گا اور ممبرز کے اضرار کی تلافی کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتا رہے گا۔اس سرمایہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک حصہ آئندہ پیش آمدہ اضرار کی تلافی کے لئے' دوسرا ضروری اخراجات کے لئے' تیسرا ممبرز کو بونس یا ہدیہ کے طور پر دینے کے لئے۔اس طرح تکافل کمپنی انجمن امداد باہمی کی طرز پر منافع بخش کاروبار بھی کرسکے گی اور انشورنس کا متبادل بھی لوگوں کو میسر آجائے گا۔اور یہ شریعت مطہرہ کے منشاء کے مطابق ہے کہ اس میں تعاون علی البر والتقوی کی روح موجود ہے۔اور حکم ربانی ہے **وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (المائدہ ۵/ ۲)** ڈاکٹر عبدالمنعم البدراوی نے اپنی کتاب **التامین فی القانون المصری والمقارن** ' میں لکھا ہے: **والتامین التعاونی باشکاله ومنه التامین علی الحیاة جائز شرعیا. بل هو امر مرغوب فیه لانه یدخل فی عقود التبرعات ومن قبیل التعاون المطلوب شرعا علی البر والخیر کما هو موضح فی قوله تعالی و باتفاق الفقهاء. وهو من مظاهر التکافل والتضامن فی الاحداث والمحن.(التامین فی القانون المصری والمقارن. ص ۳۶۔۴۰)**

اس کی جزئیات میں غور کریں تو نہ شرعا تبرع کی ممانعت ہے۔نہ تبرعات کی رقم سے جس مقصد کے لئے تبرعات جمع ہوئے (یعنی ممبرز کی عندالضرورۃ مدد واعانت)

اس میں تبرعات کے خرچ کرنے کی ممانعت ہے۔ اور نہ اس سرمایہ کو مضاربت ومشارکہ کے جائز شرعی کاروبار میں لگانے کی ممانعت۔ پھر اس سرمایہ سے ممبرز کو ہدیہ دینے کی کوئی شرعی ممانعت ہے اور نہ اس سارے نظام کو چلانے والے ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنے کی ممانعت۔ تکافل کمپنی یہ کرسکتی ہے کہ ہر ممبر سے ممبر سازی کے وقت سروس چارجز وصول کرے۔ تاکہ وہ یہ سارا انتظام قائم کرسکے۔

اس طرح کی تعاونی وتکافلی انشورنس میں نہ تو کوئی مفاسد ہیں نہ غرر اور قمار یا ربا کی کوئی صورت ہے۔

....

رطب و یابس (مجموعہ مقالات و مضامین)

اس کتاب میں ڈاکٹر شاہنواز صاحب کے حسب ذیل مقالات و مضامین شائع ہوئے ہیں۔

قرآن و سنت سے متعلق مضامین

۱۔ اعجاز القرآن
۲۔ قرآن غیر مسلموں سے نفرت کا درس نہیں دیتا
۳۔ نبی اکرم ﷺ بحیثیت حکم و قاضی
۴۔ نقش نعلین رسول ﷺ کی برکات

فقہی مضامین

۵۔ اسلامی نظام حدود و تعزیرات کی حکمت
۶۔ رحم کرائے پر لینے کی شرعی حیثیت
۷۔ شکاگو تحریک اور شہادت کے تقاضے
۸۔ رمضان المبارک تاریخی تناظر میں
۹۔ نماز تراویح چند توجہ طلب پہلو
۱۰۔ تعداد رکعت تراویح
۱۱۔ ماہ رجب کی مذہبی و تاریخی اہمیت
۱۲۔ علامہ ابن سلام ہروی رحمہ اللہ
۱۳۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی افکار و نظریات۔

شخصیات و بلاد پر مضامین

۱۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور مولانا فضل حق خیر آبادی
۱۵۔ علامہ محمد ابوزہرہ مصری
۱۶۔ الشیخ علی طنطاوی
۱۷۔ علامہ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ
۱۸۔ ڈاکٹر عبدالجواد خلف اور جامعۃ الدراسات الاسلامیہ
۱۹۔ جہد مسلسل کی کہانی
۲۰۔ برونائی میں اسلام
۲۱۔ دورویز ویلا میں اسلام
۲۲۔ عمان سلطان قابوس کی قیادت میں۔

مختلف النوع

۲۳۔ انسانیت کی پستی
۲۴۔ مقصد تخلیق پاکستان
۲۵۔ عربی مدارس کے لاکھوں طلبہ سوال کرتے ہیں
۲۶۔ دینی مدارس میں درجہ بندی کا نقصان
۲۷۔ نظام تعلیم ایک جائزہ
۲۸۔ جنگ خلیج کے خفیہ گوشے
۲۹۔ سعودی عربیہ کا سیاسی بحران ٹل گیا
۳۰۔ تہذیب آگہی
۳۱۔ زوال امت مسلمہ یا آزمائش ؟

(یہ مقالات ہر شہر کے معروف کتب خانہ اور مجلہ فقہ اسلامی کے دفتر سے دستیاب ہیں)

کاغذی کرنسی

کی

تاریخ۔ ارتقاء۔ شرعی حیثیت

تحریر

عبداللہ سلیمان المنیع

ترجمہ

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار، کراچی۔

پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کی دیگر کتب و رسائل

- تاریخ نفاذ حدود
- کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت
- کریڈٹ کارڈ (تاریخ، تعارف، شرعی حیثیت)
- کلوننگ (خدشات، شرعی نقطہ نظر)
- امام وخطیب کی شرعی ومعاشرتی حیثیت
- مختصر نصاب سیرت
- مختصر نصاب فقہ
- مختصر نصاب قرآن
- مختصر نصاب حدیث
- انڈیکس شرح صحیح مسلم
- روزہ رکھے مگر!
- قربانی کیسے کریں
- آسان و مختصر دعائیں
- لوگ کیا کہیں گے؟
- کڑوی روٹی
- منتخب مباحث علوم القرآن
- پندرھویں صدی کا مجدد کون؟
- شیئرز کے کاروبار کی شرعی حیثیت
- رطب ویابس (مجموعہ مضامین)
- بینکوں کے ذریعہ زکوٰۃ کی کٹوتی کی شرعی حیثیت
- مفتی کون؟ فتویٰ کس سے لیں؟
- اسلامی بینکاری اور سودی بینکاری میں فرق
- لیزنگ (اجارہ)
- چند منتخب معاملات کی شرعی حیثیت
- مسئلہ ختم نبوت اور تعارف قادیانیت
- جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل